سلسلہ احیاء منہج السلف (۱۴)

انتاج : مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام، فرع (۱)

رئيس المكتبة : فضیلۃ الشیخ/ علی بن عبداللہ النمی حفظہ اللہ تعالیٰ

مدير المكتبة : فضیلۃ الشیخ/ عبداللہ ناصر الرحمانی حفظہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ عبداللہ بن سلام لترجمۃ کتب الاسلام

ہیڈ آفس 103۔ڈی۔او۔ایچ۔ایس فیز II ملیر کینٹ کراچی۔

ملنے کا پتہ جامع مسجد الراشدی موسیٰ لین لیاری کراچی۔فون: 0300-3996630 0331

سعد بن عبدالعزیز موبائل: 0300-2310189

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

فہرست مضامین

تقدیم

بسم الله الرحمن الرحيم

ان الحمد لله نحمده ونستعينه، ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور انفسنا، ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله.

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ (آل عمران:۱۰۲)

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴿۱﴾

(النساء: ۱)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۱﴾ (الاحزاب:۷۰،۷۱)

أما بعد:

فإن أصدق الحديث كتاب الله، وأحسن الهدى هدى محمد ﷺ، وشر الأمور محدثاتها، وكل محدثة بدعة، وكل بدعة ضلالة، وكل ضلالة في النار.

زیرِ نظر رسالہ متواضعہ، ایک حدیث کی شرح پر مشتمل ہے، یہ حدیث اہلِ علم کے نزدیک

(حدیث جبریل) کے نام سے مشہور ہے، جبریل امین علیہ السلام جو تمام انبیاء ومرسلین کے امین وحی ہیں، رسالت مآب ﷺ کی وفات سے چند روز قبل انسانی شکل میں تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت کے ساتھ تشریف فرما تھے۔

جبریل علیہ السلام کی آمد کا مقصد لوگوں کو انتہائی اختصار کے ساتھ مہمات دین کی آگاہی دینا تھا، جس کیلئے وہ چند سوالات لیکر آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور آپ ﷺ نے ان کے بندھے تکے الفاظ میں جوابات ارشاد فرمائے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو (اصل الاسلام) قرار دیا ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ نے اسے (ام السنۃ) کہا ہے، حافظ ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: جس طرح سورۃ الفاتحہ، ام القرآن ہے، اسی طرح حدیث جبریل (أم السنۃ) ہے، حافظ ابن رجب البغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث پورے دین کی شرح پر مشتمل ہے۔

ہم نے اسی اہمیت کے پیشِ نظر، حدیث جبریل کو اردو دان طبقہ کیلئے بطورِ شرح منتخب کیا، اس شرح کی تیاری میں بہت سے مراجع پیشِ نظر رہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ: فتح الباری للحافظ ابن حجر، جامع العلوم والحکم للحافظ ابن رجب، شرح الأربعین النوویۃ للشیخ صالح بن عثیمین رحمہ اللہ اور شرح حدیث جبریل فی تعلیم الدین للشیخ عبدالمحسن بن حمد العباد البدر حفظہ اللہ سے استفادہ کیا، اس کے علاوہ جابجا کچھ اپنی طرف سے زوائد بھی سپردِ قلم کیے۔

اللہ تعالیٰ ہماری اس حقیر سی کاوش کو شرفِ قبولیت عنایت فرمائے، اور اسے میرے اور میرے والدین اور جملہ اساتذہ اور تمام متعلقین ومعاونین کی نجات کا ذریعہ بنادے، اور اس متواضع سی کوشش کو ایک خلق کثیر کی ہدایت کا ذریعہ بنادے۔ إنہ سمیع قریب مجیب للدعوات وأصلی وأسلم علی نبیہ محمد وعلی آلہ وصحبہ وأھل طاعتہ أجمعین۔

کتبہ/ عبداللہ ناصر رحمانی

متن حدیث مع ترجمہ

عن عمر رضي الله عنه قال: بینما نحن جلوس عند رسول الله ﷺ ذات یوم إذ طلع علینا رجل شدید بیاض الثیاب شدید سواد الشعر لایری علیه اثر السفر ولایعرفه منا أحد حتی جلس إلی النبی ﷺ فأسند رکبتیه إلی رکبتیه ووضع کفیه علی فخذیه وقال: یا محمد أخبرنی عن الإسلام، فقال رسول الله ﷺ: الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وتقیم الصلاة، وتؤتی الزکاة، وتصوم رمضان، وتحج البیت إن استطعت إلیه سبیلا. قال: صدقت. فعجبنا له یسأله ویصدقه، فقال: فأخبرنی عن الإیمان، قال: أن تؤمن بالله، وملائکته، وکتبه ورسله، والیوم الآخر، وتؤمن بالقدر خیره وشره. قال: صدقت. قال فأخبرنی عن الاحسان، قال: أن تعبد الله کأنك تراه، فإن لم تکن تراه فإنه یراك. قال: فأخبرنی عن الساعة، قال: ما المسئول عنها بأعلم من السائل. قال: فأخبرنی عن أماراتها، قال: أن تلد الأمة ربتها، وأن تری الحفاة العراة العالة رعاء الشاء یتطاولون فی البنیان. ثم انطلق فلبثت ملیا ثم قال: یا عمر أتدری من السائل؟ قلت: الله ورسوله أعلم. قال فإنه جبریل أتاکم یعلمکم دینکم۔[1]

ترجمہ: امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اس مجلس میں ایک شخص نمودار ہوا، جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے، اس جسم پر سفر کی علامات موجود نہ تھیں اور نہ ہی ہم میں سے

(۱) رواہ مسلم، کتاب الإیمان، باب الایمان والاسلام والاحسان ووجوب الایمان باثبات قدر اللہ سبحانہ وتعالی، حدیث (۸)

کوئی اسے پہچانتا تھا، حتی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا (وہ اس طرح کہ) اپنے دونوں گھٹنے نبی ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ جوڑ دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے، اور کہا: اے محمد ﷺ مجھے اسلام کی بابت خبر دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود حق نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور گواہی دو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر طاقت ہو۔

اس نے کہا: آپ نے سچ فرمایا۔ ہمیں تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی سوال کر رہا ہے اور خود ہی اس کے جواب کی تصدیق کر رہا ہے۔

پھر اس نے کہا: مجھے ایمان کی بابت خبر دیجئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ایمان یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاؤ، نیز تقدیر پر بھی ایمان لاؤ، خواہ وہ اچھی ہو یا بری۔

اس نے (پھر) کہا: آپ نے سچ فرمایا۔

پھر اس نے احسان کے بارے میں سوال کیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (احسان یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

پھر اس نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں خبر دیجئے (یعنی کب قائم ہوگی) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے بارہ میں مسؤل کا علم سائل سے زیادہ نہیں ہے۔

تب اس نے کہا: مجھے قیامت کی نشانیاں ہی بتا دیجئے، فرمایا: ایک نشانی تو یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنم دے اور دوسری نشانی یہ ہے کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، انتہائی فقیروں اور بکریوں کے چرواہوں کو دیکھو گے کہ وہ بڑی بڑی بلڈنگوں میں فخر کرنے والے ہونگے۔

پھر وہ شخص چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ نے کچھ دیر توقف کے بعد فرمایا: اے عمر! کیا تم جانتے

ہو کہ یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ جبریل امین تھے، جو تمہارے پاس، تمہیں، تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

یہ حدیث خلیفہ ثانی، امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح مسلم میں موجود ہے، صحیح مسلم کے پہلے عنوان "کتاب الایمان" کی پہلی حدیث یہی ہے، جبکہ یہی حدیث صحیح بخاری نیز صحیح مسلم میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے موجود ہے۔

اس کے علاوہ یہ حدیث مختلف کتب میں مروی ہے، مثلاً: مسند امام احمد، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند ابی داؤد الطیالسی، صحیح ابن حبان، مسند ابو یعلی، شعب الایمان للبیہقی، شرح السنۃ للبغوی، صحیح ابن خزیمہ اور کتاب الشریعۃ للآجری وغیرہ۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں مزید پانچ صحابہ کے نام ذکر کیے ہیں، جن سے یہ حدیث مروی ہے:

① ابوذر غفاری، ان کی حدیث ابوداؤد اور نسائی میں ہے۔
② عبداللہ بن عمر، ان کی حدیث مسند احمد اور طبرانی میں ہے۔
③ انس بن مالک، ان کی حدیث مسند بزار اور خلق افعال العباد للبخاری میں ہے۔
④ جریر بن عبداللہ البجلی، ان کی روایت صحیح ابوعوانہ میں ہے۔
⑤ عبداللہ بن عباس، ان کی روایت مسند احمد میں ہے۔

اس کے علاوہ مسند احمد میں یہ حدیث بروایت ابوعامر الاشعری بھی موجود ہے۔

علماء کی نظر میں اس حدیث کی اہمیت

خود رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما کر "یہ جبریل امین تھے جو تمہیں، تمہارا دین سکھانے آئے تھے" اس حدیث کی اہمیت کو آشکارا فرمادیا، گویا یہ حدیث تعلیمِ دین کا بڑا جامع مرقع ہے اور علوم نبوت کی بڑی اہم دستاویز ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں:

"یہ حدیث تمام ظاہری و باطنی عبادات کا مجموعہ ہے، اس میں امورِ ایمان بھی ہیں اور ظاہری اعمال بھی، نیز یہ حدیث اخلاص کی تعلیم اور آفاتِ اعمال سے تحفظ جیسے امور پر بھی مشتمل ہے، تمام علوم شریعت اسی حدیث کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی حدیث سے پھوٹتے ہیں......"

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ حدیث علوم ومعارف اور آداب ولطائف کی بہت سی انواع پر مشتمل ہے، بلکہ یہ حدیث اصل اسلام ہے۔"

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مناسب ہوگا کہ اس حدیث کو اُم السنۃ (یعنی سنت کی ماں) کا نام دیا جائے؛ کیونکہ یہ حدیث تقریباً جملہ علوم شریعت کو متضمن ہے۔"

ابن دقیق العید رحمہ اللہ کا قول ہے: "جس طرح سورہ فاتحہ اُم القرآن ہے اس طرح یہ حدیث اُم السنہ ہے۔"

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ بڑی عظیم حدیث ہے، جو پورے دین کی شرح پر مشتمل ہے۔"

اس حدیث کے وارد ہونے کا قصہ

واضح ہو کہ بروایت صحیح مسلم، اس حدیث کو عبداللہ بن عمر نے اپنے والد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے ذکر فرمایا ہے، صحیح مسلم کے سیاق کے مطابق ایک سبب ظاہر ہوا تھا، جس کی بناء پر عبداللہ بن عمر نے اپنے والد گرامی کی روایت سے اس حدیث کو بیان فرمایا۔

وہ قصہ صحیح مسلم میں اس طرح مذکور ہے:

عن یحیی بن یعمر قال: کان أول من قال فی القدر بالبصرۃ معبد الجهنی، فانطلقت أنا وحمید ابن عبدالرحمن الحمیری حاجین أو معتمرین، فقلنا، لو لقینا

أحدا من أصحاب رسول الله ﷺ فسألناه عما يقول هؤلاء في القدر، فوفق لنا عبدالله بن عمر بن الخطاب داخلا المسجد، فاكتنفته أنا وصاحبي، أحدنا عن يمينه والآخر عن شماله، فظننت أن صاحبي سيكل الكلام إلي، فقلت أبا عبد الرحمن! إنه قد ظهر قبلنا ناس يقرؤون القرآن ويتقفرون العلم، وذكر من شأنهم، وأنهم يزعمون أن لا قدر، وأن الأمر أنف. قال: فإذا لقيت أولئك فأخبرهم أني بريء منهم، وأنهم برآء مني، والذي يحلف به عبدالله بن عمر! لو أن لأحدهم مثل أحد ذهبا فأنفقه ما قبل الله منه حتى يؤمن بالقدر، ثم قال: حدثني أبي عمر بن الخطاب ...الخ

ترجمہ: یحیی بن یعمر فرماتے ہیں: سب سے پہلے تقدیر کا انکار معبد الجہنی نے کیا، جس کا تعلق بصرہ سے تھا۔

میں اور حمید بن عبدالرحمن الحمیری حج یا عمرہ کے ارادے سے گھر سے نکلے، ہم نے راستے میں یہ خواہش کی، کاش مکہ مکرمہ میں نبی ﷺ کے کسی صحابی سے ملاقات ہو جائے تاکہ ہم تقدیر کے بارے میں باتیں کرنے والے ان افراد کی بابت سوال کرسکیں، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہماری مسجد حرام کے اندر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوگئی، چنانچہ میں نے اور میرے دوست نے انہیں اپنے پہلو میں لے لیا، ایک ان کے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف ہوگیا، میں نے اس یقین کے تحت کہ میرا دوست مجھے ہی گفتگو کرنے کا کہے گا، بات شروع کی اور کہا: اے ابوعبدالرحمن (عبداللہ بن عمر کی کنیت) ہمارے علاقے (بصرہ) میں کچھ لوگ ظاہر ہوئے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں اور حصول علم کے مشتاق ہیں (ان کی شان میں اور بھی باتیں کیں) لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ تقدیر کوئی چیز نہیں اور سارے کام ابتداءً ہی رونما ہوتے ہیں (یعنی تقدیر میں لکھے ہوئے نہیں ہیں)

عبداللہ بن عمر نے فرمایا: جب تم واپس جا کر ان لوگوں سے ملو تو انہیں بتا دو کہ عبداللہ ان سے بری اور لاتعلق ہے اور وہ عبداللہ سے بری اور لاتعلق ہیں، اس ذات کی قسم جس کی عبداللہ ہمیشہ قسم کھاتا ہے ان میں سے کسی شخص کے پاس اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور وہ اللہ کی راہ میں خرچ کردے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک قبول نہیں فرمائے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لے آئیں، پھر فرمایا: میرے والد عمر بن الخطابؓ نے مجھے یہ حدیث سنائی ہے......الخ (پھر پوری مذکورہ حدیث بیان فرمائی)

حدیث ابن عمر کے علمی فوائد

معلوم ہونا چاہیئے کہ اس قصہ میں بہت سے علمی فوائد و آداب ہیں، پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ تقدیر کے انکار کا فتنہ دورِ صحابہ میں ظاہر ہو چکا تھا، چنانچہ سب سے پہلے تقدیر کے انکار کا فتنہ بصرہ میں ظاہر ہوا، اس بدعت کا بانی و موسس معبد الجہنی تھا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تابعین عظام کس طرح بڑے بڑے امور کی رہنمائی کیلئے صحابہ کرام کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، چنانچہ یحیی بن یعمر اور حمید بن عبدالرحمن الحمیری جو تقدیر کے بارے میں معبد الجہنی کے نظریات سن کر پریشان تھے نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے کسی صحابی سے ملاقات ہو جائے تو اس فتنہ کی بابت ان سے رہنمائی لی جائے۔

اس سے یہ اہم نکتہ حاصل ہو رہا ہے کہ ہر مسلمان کا یہ شرعی فریضہ ہے کہ وہ امورِ دین کے سلسلے میں اپنی رائے ظاہر کرنے اور منوانے کی بجائے اہل علم سے رجوع کرے، اللہ تعالیٰ کے فرمان: [فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝] کا یہی تقاضا ہے۔

اس واقعہ سے ایک عظیم الشان نکتہ یہ بھی حاصل ہو رہا ہے کہ جو لوگ حج یا عمرہ کے سلسلے میں حرمین شریفین کی طرف عازم سفر ہوں تو وہ حج و عمرہ کے ساتھ ساتھ، علماءِ حرمین سے علمی استفادہ کے مواقع بھی تلاش کرتا رہے، بالخصوص اگر کسی مسئلہ کے تعلق سے وہ کسی اشکال کا شکار ہو۔

چنانچہ اگر بلادِ حرمین میں حج و عمرہ کے ساتھ ساتھ اس کی اعتقادی و عملی مشکلات بھی حل ہو جائیں تو اس کا یہ سفر مزید مبارک اور نتائج طیبہ کے حصول کا سبب بن جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین)

یعنی: اللہ رب العزت جس شخص کے ساتھ بھلائی کا فیصلہ فرمالے تو اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ یہ سفرِ حج و عمرہ جو سراسر خیر و برکت کا سفر ہے، اس میں اگر طلبِ علم کے اسباب بھی مہیا ہو جائیں تو یہ سفر نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائے گا۔

خوارج کے رد میں ایک حدیث

اسی طرح کا ایک اور واقعہ، امام مسلم اپنی صحیح میں لائے ہیں، جس کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا، یزید الفقیر فرماتے ہیں:

''کسی دور میں میرا میلان خوارج کے ایک عقیدہ کی جانب ہو گیا، میں ایک جماعت کے ہمراہ حج کیلئے نکلا، ہمارا یہ بھی ارادہ تھا کہ اس موقع پر (تفقہ فی الدین کیلئے) اہل علم سے بھی ملاقاتیں کریں گے، ہم مدینہ منورہ میں تھے، ہم نے دیکھا کہ صحابیٔ رسول سیدنا جابر بن عبداللہؓ مسجد نبوی کے ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے درسِ حدیث ارشاد فرما رہے ہیں، ان کے درس میں اہل جہنم کا ذکر ہوا (ان اہل جہنم کا جو اپنی سزا بھگت کر جہنم سے نکال لئے جائیں گے) میں نے اعتراض وارد کیا اور کہا: آپ یہ کیا بیان کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے:

[اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ]

یعنی: جنہیں تو جہنم میں ڈال دے انہیں تو نے رسوا کر دیا۔

نیز فرماتا ہے: [كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا]

یعنی: جب جہنمی جہنم سے نکلنا چاہیں گے تو وہ دوبارہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے۔ (ان

نصوص سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ جو جہنم میں داخل ہوا وہ کبھی نہ نکل پائے گا جیسا کہ خوارج کا عقیدہ ہے)

جناب جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم قرآن پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: کیا تم نے قرآن پاک میں مقامِ محمود کا ذکر پڑھا ہے جو اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے گا؟ عرض کیا: جی ہاں۔

تو آپ نے فرمایا: اسی مقامِ محمود میں آپ کی شفاعت کی برکت سے اللہ تعالیٰ جہنم سے بہت سے لوگوں کو نکال دے گا۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے: جہنم سے ایک قوم نکالی جائے گی، جو کہ کوئلہ بن چکی ہوگی، پھر انہیں جنت کی ایک نہر میں غسل دیا جائے گا، جس سے آہستہ آہستہ ان کے جسم لوٹ آئیں گے اور انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

یزید الفقیر فرماتے ہیں: سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی زبان سے ان احادیث کو سن کر میں نے خوارج والے عقیدے سے رجوع کر لیا، اور برملا اپنے ساتھیوں سے کہا: یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ شیخ (جابر) نبی ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کر سکے، میری یہ بات سن کر میرے تمام ساتھیوں نے خوارج کی رائے سے توبہ کر لی، صرف ایک شخص نے بات نہیں مانی اور وہ خارجیت پر قائم رہا۔

غور کیجئے جو لوگ سفرِ حج وعمرہ کے دوران تعلیمِ علم کی نیت کر لیں، تو کس طرح ان کی نیت کی اللہ تعالیٰ تکمیل فرماتا ہے، ان کی رہنمائی فرماتا ہے اور ایسے علماء سے ملاقات کی توفیق مرحمت فرماتا ہے جو کتاب وسنت کے کنوز وحقائق سے مالا مال ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے بہت کچھ عقیدہ کی اصلاح کے مواقع میسر آجاتے ہیں، چنانچہ یزید الفقیر، جس کا نظریہ یہ تھا کہ مرتکب کبیرہ ہمیشہ کا جہنمی ہے، یہی خوارج کا عقیدہ تھا اور وہ اس سلسلہ میں قرآن حکیم سے کچھ نصوص پیش کرتا تھا، حالانکہ ان نصوص کا محل کفار ہیں نہ کہ اہل الکبائر۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی نیت کا صلہ دیا اور صحابیِ رسول جابر رضی اللہ عنہ سے ملوا دیا، انہوں نے احادیث

رسول ﷺ کے ذریعے ان کے عقیدۂ فاسدہ کی حقیقت کھول دی اور انہوں نے شرح صدر کے ساتھ تائب ہو کر خوارج کے عقیدہ سے رجوع کر لیا۔

تو گویا یہ بھی ایک بڑی فضیلت وسعادت ہے جو سفرِ حج یا عمرہ کے عظیم تر مقاصد کا اہم حصہ ہے، واللہ ولی التوفیق

حدیث ابن عمر سے مستنبط چند آداب

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے مذکورہ واقعہ میں، حسنِ ادب کے بہت سے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں، چنانچہ دونوں تابعین (یحییٰ بن یعمر اور عبید الحمیری) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دائیں اور بائیں ہو جاتے ہیں اور اپنے شیخ کو وسط میں کر لیتے ہیں، جو ادب واحترام کا مظہر ہے، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس طرح دونوں کو اپنے شیخ کا برابر کا قرب حاصل رہے گا، جس سے ان کے جواب کا سماع اور فہم ممکنہ حد تک آسان ہو جائے گا۔

اسی طرح عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ان کا نام لیکر مخاطب کرنے کی بجائے کنیت پر اکتفاء کیا، یہ بھی حسنِ ادب کے مظاہر میں سے ہے۔

واضح ہو کہ ایک دوسرے کو اس کی کنیت سے مخاطب کرنے کا رواج ہمارے معاشرہ میں مفقود دکھائی دیتا ہے، جبکہ بلادِ عرب میں اب بھی لوگوں کی بیشتر مخاطبت کنیت کے ساتھ ہی ہوتی ہے، جو کہ تشریف وتکریم کا حسین مظہر ہے۔

مذکورہ واقعہ سے یہ استدلال بھی درست ہو گا کہ شیخ اگر چل رہا ہو تو چلتے چلتے اس سے سوال کرنا صحیح ہے، اور شیخ کا چلتے چلتے جواب دے دینا بھی درست ہے۔ اس میں وقت کے عدمِ ضیاع کا اثر بھی موجود ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے کتاب العلم میں اسی نکتہ کے پیشِ نظر کچھ ابواب قائم فرمائے ہیں، مثلاً: سواری پر کھڑے کھڑے فتویٰ دینے کا بیان اور رمی الجمار کے موقع پر سوال کرنے اور فتویٰ دینے کا بیان وغیرہ۔

منکرین قدر کا نظریہ

واضح ہو کہ یحیی بن یعمر اور عبید الحمیری نے جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بصرہ میں ظاہر ہونے والی ایک انتہائی قبیح اور خطرناک بدعت کی بابت سوال کیا تھا، یہ بدعت تقدیر کا انکار ہے، جس کا موجد معبد الجہنی تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق کا منکر تھا اور بالتبع کتابت تقدیر کا بھی، اس کا نظریہ یہ تھا کہ انسانوں کا ہر عمل خواہ اچھا ہو یا برا، ابتداءً وقوع پذیر ہوتا ہے اور جب انسان عمل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں آتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی جزاء یا سزا مرتب ہوتی ہے۔

اہلِ بدعت کے متعلق سلف صالحین کا منہج

اسی منحرف عقیدہ کو سن کر جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس سے برأت اور لاتعلقی کا اعلان فرمایا تھا، جس سے منہجِ سلف عیاں ہوتا ہے کہ وہ اہلِ بدعت سے کسی تعلق یا محبت کو روا نہ جانتے تھے، ان کے تعلقات تو حدیث رسول ﷺ "الحب في الله والبغض في الله" کے مصداق تھے۔

مگر افسوس آج جو لوگ منہجِ سلف کے امین ہونے کے دعویدار ہیں ان میں سے بیشتر لوگ اس انتہائی اہم منہجی نکتہ سے عمداً یا جہلاً صرفِ نظر کئے ہوئے ہیں۔

کاش یہ لوگ اتنی سی بات سمجھ لیں کہ دینِ اسلام میں تعلق کی بنیاد اللہ وحدہ لاشریک لہ کی توحید اور سید الاولین والآخرین رسول کریم ﷺ کی سنت ومحبت ہے، نہ کہ جاہ ومال اور عصرِ حاضر کی سیاستِ خبیثہ۔

تقدیر پر ایمان کے مراتب کا ذکر، شرحِ حدیثِ جبریل کے ضمن میں ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان دونوں تابعین کے سوال کے جواب میں صرف حکمِ مسئلہ کے ذکر پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے دلیل بھی پیش کی، اس سے سلف صالحین کا مبارک منہج سامنے آتا ہے، یعنی کسی مسئلہ کے حکم کے ساتھ دلیل بتلانا ضروری ہے اور دلیل اقوالِ رجال یا ملفوظاتِ مشایخ کا نام نہیں، بلکہ اکرم الخلائق محمد رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا نام

ہے۔ بیشتر اسلام کے دعویدار اس پاکیزہ منہج سے انحراف کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں، نتیجۃً گمراہیوں کی دلدل گہری سے گہری ہوتی جارہی ہے۔ واللہ المستعان۔

حدیث جبریل علیہ السلام کی تشریح

راوی حدیث امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

بينما نحن جلوس عند رسول الله ﷺ ذات يوم إذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب شديد سواد الشعر لايرى عليه اثر السفر ولايعرفه منا أحد حتى جلس إلى النبي ﷺ فأسند ركبتيه إلى ركبتيه ووضع كفيه على فخذيه.

ترجمہ: ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک اس مجلس میں ایک شخص نمودار ہوا، جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے، اس کے جسم پر سفر کی علامات موجود نہ تھیں اور نہ ہی ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، حتی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا (وہ اس طرح کہ) اپنے دونوں گھٹنے نبی ﷺ کے گھٹنوں کے ساتھ جوڑ دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ لئے۔

رسول اللہ ﷺ کی تواضع

حدیث کے اس فقرہ میں بہت سا علم وادب ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو کہ سید الاولین والآخرین ہیں کا اپنے صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما ہونا، آپ ﷺ کی تواضع اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کی دلیل ہے، نیز صحابہ کرام کی عظمت وسعادت بھی مترشح ہوتی ہے کہ امام الانبیاء ﷺ ان کے درمیان تشریف فرما ہیں۔

طالب علم کے آداب

یہاں علمی نکتہ یہ ہے کہ ایک شیخ کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ بیٹھے اور انہیں

علم دے، یہ بیٹھنا رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق ہوگا اور یہی نیت شیخ اور اس کے تلامذہ کو مستحضر ہونی چاہئے۔ البتہ یہاں ایک ادب کی نشاندہی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ جب شیخ اپنے طلبۃ العلم کو وقت دے اور ان کے درمیان بیٹھے تو طلبہ غیر ضروری باتوں سے اپنے شیخ کا وقت ضائع نہ کریں اور بہت زیادہ سوالات سے گریز کریں، یہ اہم اور نفیس نکتہ بھی حدیث جبریل سے حاصل ہو رہا ہے، چنانچہ انہوں نے اتنی دور سے تشریف لا کر رسول اللہ ﷺ سے ضرورت دین کے تعلق سے محض چند سوالوں پر اکتفاء کیا اور واپس تشریف لے گئے۔

لہٰذا طلبۃ العلم اپنے شیخ کے وقت اور آرام کا پورا پورا خیال رکھیں۔

اگر شیخ کی نشست کیلئے اونچے چبوترے یا کرسی وغیرہ کا اہتمام ہو تو یہ بھی سنت نبوی ﷺ سے ثابت ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں ابوذر غفاری اور ابو ھریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ يجلس بين ظهراني أصحابه.فيجيء الغريب فلا يدري أيهم هو حتى يسأل.فطلبنا إلى رسول الله ﷺ أن نجعل له مجلسا يعرفه الغريب إذا أتاه. قال:فبنينا له دكانا من طين،فجلس عليه،و كنا نجلس بجنبتيه.

یعنی: رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے درمیان (کسی امتیاز کے بغیر) بیٹھا کرتے تھے حتی کہ اگر کوئی اجنبی آتا تو وہ نبی علیہ السلام کو پہچان نہ پاتا، اور اسے پوچھنا پڑتا (کہ تم میں نبی علیہ السلام کون ہیں؟) تو ہم نے نبی علیہ السلام سے گزارش کی کہ آپ کیلئے ایک الگ (اونچی) نشست بنا دیں تاکہ ایک اجنبی بھی آپ کو فوری پہچان لے، چنانچہ ہم نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا اور رسول اللہ ﷺ اس پر تشریف فرما ہوتے اور ہم آپ کے ارد گرد بیٹھا کرتے۔

اس سے ثابت ہوا کہ معلم کیلئے اونچی نشست (کرسی وغیرہ) کا انتظام مستحسن ہے؛ تاکہ وہ پہچانا جا سکے اور تمام حاضرین اسے دیکھ سکیں۔

فرشتے بشریت کا روپ دھار سکتے ہیں

اس حدیث میں جبریل علیہ السلام کا بصورتِ بشر آنا مذکور ہے، جس سے ثابت ہوا کہ ملائکہ بشر کا روپ دھارنے کی قدرت دیئے گئے ہیں، قرآن پاک میں جبریل علیہ السلام کا مریم سلام اللہ علیہا کے پاس بصورتِ بشر، نیز ابراھیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس بھی بصورتِ بشر جانا مذکور ہے۔

لیکن فرشتے اپنی مرضی سے کسی بشر کی صورت اختیار نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن و امر کے بعد بشر کا روپ دھارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے جنوں کو بھی بشر یا سانپ وغیرہ کا روپ دھارنے کا اختیار دے رکھا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حدیثِ ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوتا ہے۔

جبریل امین اپنی اصل ہیئت میں

جبرئیل امین علیہ السلام اپنی اصل شکل و ہیئت میں، اللہ تعالیٰ کی بڑی عظیم اور قوی مخلوق ہیں، نبی ﷺ نے ان کے چھ سو پروں کا ذکر فرمایا ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: میں نے جبرئیل کو دیکھا انہوں نے تمام آفاق سماوی کو ڈھانپ رکھا تھا۔

حدیث جبرئیل کے مذکورہ بالا متن میں ان کے سلام کہنے کا ذکر نہیں ہے، لیکن ابوداؤد میں بروایت ابوذر غفاری وابوھریرہ رضی اللہ عنہما مروی حدیث میں ان کے سلام کہنے کا ذکر موجود ہے، اسی سیاق میں نبی ﷺ کے جواب دینے کا ذکر بھی ہے۔

طالب علم کے چند مزید آداب

جبرئیل علیہ السلام کا نبی ﷺ کے سامنے بیٹھنا بھی بہت سے علوم وآداب کا مظہر ہے، ایک ادب تو یہ کہ ان کا نبی علیہ السلام کے انتہائی قریب بیٹھنا، چنانچہ ہر طالب علم کو اپنے شیخ کی مجلس کے قرب کا متمنی ہونا چاہئے، یہ نکتہ نبی علیہ السلام کی ان احادیث سے بھی حاصل ہوتا ہے جن میں جمعہ کے روز خطیب کے

قریب بیٹھ کر خطبہ سننے والوں کی فضیلت کا ذکر ہے۔ دیگر احادیث سے بھی شیخ کی مجلس کا قرب اختیار کرنے کی فضیلت ثابت ہے۔

دوسرا ادب جبریل علیہ السلام کے اندازِ نشست سے سامنے آتا ہے، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دوزانوں ہو کر بیٹھے، جو کہ حسنِ تواضع کا مظہر ہے، ایک طالب علم کو اسی طرح اپنے شیخ کے احترام اور تعظیم کے جملہ پہلو اپنانے چاہئیں۔

جبریل امین علیہ السلام نے اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے یا نبی ﷺ کے گھٹنوں پر رکھے؟ اس مسئلہ میں علماء کے دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں، امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں صراحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے تھے، جبکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح میں کچھ روایات نقل فرمائی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے نبی علیہ السلام کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ "ثم وضع یدہ علی رکبتی النبی ﷺ"، یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا طالب علم کو اپنے شیخ کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے چاہئیں؟ جواب: نہیں۔

تو پھر جبریل علیہ السلام کے اسلوب کے بارہ میں کیا کہا جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام صحابہ کرام کے سامنے انسانی شکل میں آئے تھے اور چاہتے تھے کہ لوگ ان کی اصل وضع یعنی ان کا فرشتہ ہونا پہچان نہ سکیں، بلکہ انہیں کوئی اعرابی خیال کریں؛ کیونکہ اعرابی اکثر اپنے دیہاتوں سے آ کر نبی علیہ السلام سے دین کی بابت سوال کیا کرتے تھے، اور چونکہ اعرابی اس تہذیب وتمدن سے ناآشنا ہوتے تھے جو عام طور پر شہریوں میں پائی جاتی ہے، لہذا بعض اوقات ان کے رویے میں درشتگی ہوتی۔ جبریل علیہ السلام نے بھی کچھ ایسے افعال کا مظاہرہ کیا جن سے انہیں ایسا ہی اعرابی سمجھا جائے۔ مثلاً: ان کا گردنیں پھلانگ کر نبی علیہ السلام کے قریب پہنچ جانا اور اپنے ہاتھوں کا نبی علیہ السلام کے گھٹنوں پر رکھ دینا اور گفتگو کا آغاز "یارسول اللہ" کی بجائے "یا محمد" سے کرنا، جیسا کہ اعرابیوں کا اندازِ تخاطب ہوا کرتا تھا۔

جبریل امین ایسا اس لئے چاہتے تھے کہ لوگ انہیں حقیقی سائل یا مستفسر سمجھ کر ان کے سوالوں اور نبی علیہ السلام کے جوابوں پر توجہ دیں، اگر انہیں ایسا کوئی اثر مل جاتا جس سے لوگ ان کی حقیقت پہچان جاتے تو شاید لوگ اسی حقیقت میں غور وخوض کرتے رہتے، جس سے شاید اصل مقصد پورا نہ ہو پاتا۔ (واللہ اعلم)

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بڑے مقصد کے حصول کیلئے توریہ جائز ہے (یعنی ایک شی حقیقۃ الامر میں کچھ ہو لیکن کسی شرعی مصلحت کے خاطر اسے کسی دوسری حقیقت میں ظاہر کیا جائے)

آدابِ شیخ

جبریل علیہ السلام کے آنے اور بیٹھنے کے انداز سے ایک نکتہ اور بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایسے موقع پر شیخ کو صبر، حلم اور تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور کسی شاگرد سے اگر کسی جفاء کا اظہار ہوتا ہے تو اسے تحمل سے برداشت کر لینا چاہئے، اور اس طالب علم کو اس کا مطلوبہ علم دینے کے بعد اس جفاء کے تعلق سے اسے نصیحت دے دینی چاہئے۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ دین کی یہ تمام باتیں جبریل علیہ السلام نے خود کیوں نہ بتلادیں؟ سوالات کا تکلف کیوں کیا؟ جبکہ ان کی ذات سارے انبیاء کے امین وحی کے طور پر متعارف ومعروف ہے۔

اس کا جواب (واللہ اعلم) یہ ہو سکتا ہے کہ جبریل علیہ السلام جب بھی وحی لائے اسے صرف رسول اللہ ﷺ نے سنا، لیکن آج جب آپ انسانی روپ میں تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ کے اردگرد صحابہ کرام کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی، یعنی نبی اپنے امتیوں کے ساتھ تشریف فرما تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا ایک عظیم حق

یہاں نکتہ یہ ہے کہ امتیوں کی موجودگی میں نصیحت کرنے یا سوالات کے جوابات دینے کا حق

صرف رسول اللہ ﷺ کا ہے،گویا امتیوں کی موجودگی میں امین الوحی جبرئیل علیہ السلام بھی ایک سائل بن کر پیش ہونگے،مفتی یا مجیب بن کر نہیں۔

یہ ایک ایسا ادب ہے جس کا ہر امتی کے پیشِ نظر ہونا اور رہنا ضروری ہے،جس طرح ذاتِ رسول کی موجودگی میں کسی کو بات کرنے یا جواب دینے کا حق نہیں ہے (خواہ وہ جبرئیل علیہ السلام ہی کیوں نہ ہوں) اسی طرح فرمانِ رسول کے ہوتے ہوئے بھی کسی کو دوسری بات کہنے یا جواب دینے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا،اللہ تعالیٰ کا فرمان ذیل اسی حقیقت کا متقاضی وموجب ہے:

[يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ]

آیت کریمہ بڑی صراحت سے،اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ سے آگے ہونے یا کسی اور کو آگے کرنے کی ممانعت سمجھا رہی ہے۔

جوخوش نصیب لوگ یہ نکتہ سمجھ جائیں وہ حقیقی معنی میں فہم دین کے عظیم منصب پر فائز ہیں اور جو اس نکتہ کے فہم سے عاری ہیں ان کے مقدر میں تقلید کی دلدل میں پھنسے رہنے اور اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتے رہنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

[يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝۳۳]

[وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ]

ooooooooo

جبریل کا پہلا سوال:اسلام کیا ہے؟

وقال:يا محمد أخبرني عن الإسلام.فقال رسول الله ﷺ:الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله،وتقيم الصلاة،وتؤتي الزكاة،وتصوم رمضان،وتحج البيت إن استطعت إليه سبيلا.قال:صدقت.فعجبنا له يسأله ويصدقه.

ترجمہ:"اور کہا:اے محمد ﷺ مجھے اسلام کی بابت خبر دیجئے،رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبودِ حق نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے،اور گواہی دو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکاۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو اگر طاقت ہو۔

اس نے کہا:آپ نے سچ فرمایا۔ہمیں تعجب ہوا کہ یہ شخص خود ہی سوال کررہا ہے اور خود ہی اس کے جواب کی تصدیق کر رہا ہے۔"

اسلام اور ایمان میں فرق

جبرئیل علیہ السلام کا پہلا سوال اسلام کی بابت تھا،جواب میں رسول اللہ ﷺ نے چند ظاہری امور کا تذکرہ فرمایا (جن کی وضاحت عنقریب آئے گی) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام چند ظاہری امور کا نام ہے،اور جب جبرئیل علیہ السلام نے ایمان کی بابت پوچھا تو آپ ﷺ نے چند باطنی امور کا ذکر فرمایا (جن کا بیان آگے آئے گا) جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان چند باطنی امور کا نام ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور ایمان دو ایسے کلمات ہیں کہ جب انہیں اکٹھا ذکر کیا جائے گا تو دونوں کے معنی میں فرق ہوگا،جیسا کہ حدیث جبرئیل میں دونوں اکٹھے مذکور ہیں،چنانچہ انہوں نے پہلے اسلام کا پھر ایمان کا معنی دریافت کیا،تو آپ ﷺ نے دونوں کی علیحدہ علیحدہ تعریف ذکر فرمائی،اسلام کی تعریف میں پانچ اعمالِ ظاہرہ ذکر فرمائے اور ایمان کی تعریف میں چھ اعمالِ باطنہ ذکر فرمائے (جن کا تعلق تصدیق واقرار سے ہے)۔

لیکن یہی دو کلمے جب الگ الگ ذکر ہونگے تو ہر کلمہ دونوں معانی (یعنی اعمالِ ظاہرہ وباطنہ) کو شامل ہوگا۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل فرمان میں صرف اسلام کا ذکر ہے:

[وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵]

یعنی جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو چاہے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں اسلام سے مراد صرف وہ پانچ اعمال ظاہرہ ہی نہیں ہیں جن کا حدیث جبرئیل میں ذکر ہے، بلکہ یہاں لفظ اسلام پورے دین کو شامل ہے جس میں تمام اعمالِ ظاہرہ اور اعمالِ باطنہ داخل ہیں۔

صرف لفظ ایمان کا استعمال، اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں ہے:

[وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝]

یعنی جو ایمان کے ساتھ کفر کرے گا اس کے تمام اعمال اکارت جائیں گے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔

یہاں ایمان سے مراد صرف وہ اعمال باطنہ ہی نہیں ہیں جن کا حدیث جبرئیل میں ذکر ہے، بلکہ یہاں کلمہ ایمان پورے دین کو شامل ہے، جس میں ظاہری و باطنی تمام اعمال داخل ہیں۔

اسلام کے بنیادی ارکان

جبرئیل علیہ السلام کے سوال: "اسلام کے بارے میں خبر دیجئے" کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے پانچ امور کا ذکر فرمایا:

① "لا إله إلا الله" اور "محمد رسول الله" کی گواہی دینا۔

② نماز قائم کرنا۔

③ زکاۃ دینا۔

④ رمضان کے روزے رکھنا۔

⑤ استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرنا۔

یہ ارکان خمسہ کہلاتے ہیں، جن کا ذکر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: بني الاسلام على خمس ...الحديث۔

یعنی اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے......۔

پھر آپ ﷺ نے مذکورہ بالا پانچوں امور بیان فرما دیئے جن کا ذکر حدیث جبریل میں ہے۔

"محمد رسول اللہ" کی شہادت کی اہمیت

ان پانچ ارکان میں "لا الہ الا اللہ" اور "محمد رسول اللہ" کی گواہی سب سے مقدم ہے، جس سے ان دونوں اعتقادی امور کی حقیقت واہمیت اجاگر ہوتی ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ رب العالمین کی توحید نہ صرف یہ کہ اصل الاصول ہے بلکہ تمام اعمال وعقائد میں سب سے مقدم نکتہ ہے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی مذکور ہے، اور یہ دونوں گواہیاں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔

یعنی اگر کوئی شخص "لا الہ الا اللہ" کی گواہی دیتا ہے مگر "محمد رسول اللہ" کی گواہی نہیں دیتا یا اس گواہی میں کسی انحراف کا شکار ہے تو اس کی "لا الہ الا اللہ" کی گواہی غیر معتبر متصور ہوگی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(والذی نفس محمد بیدہ! لا یسمع بی أحد من هذه الأمة یهودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت به إلا کان من أصحاب النار.)[1]

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری رسالت کی خبر اس امت کے کسی فرد کو پہنچی خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ اس پر ایمان نہ لایا تو وہ جہنمیوں میں سے ہوگا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص "محمد رسول اللہ" کی گواہی دیتا ہے، لیکن "لا الہ الا اللہ" کی گواہی میں کسی

---

[1] صحیح مسلم

انحراف یا اضطراب کا شکار ہے تو اس کی مذکورہ گواہی غیر معتبر اور مردود ہوگی۔

جبریل امین علیہ السلام نے، نبی ﷺ سے جو مختلف سوال کیے، ان میں سے پہلا سوال، اسلام کی بابت تھا، آپ ﷺ نے اسلام کی تعریف میں پانچ امور کا ذکر فرمایا:

① أتشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله

یعنی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ حق نہیں ہے اور گواہی دینا کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اسلام کا اہم ترین نکتہ، توحید ورسالت کی گواہی

اسلام کے تعلق سے پہلا نکتہ جو سب سے اہم ہے، دو گواہیوں پر قائم ہے، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ (لا إله إلا الله) اور "محمد رسول الله" کا محض اقرار کافی نہیں ہے، بلکہ اقرار کے ساتھ ساتھ دل سے پوری معرفت اور بصیرت کے ساتھ گواہی دینا بھی ضروری ہے۔

سورۃ الزخرف میں اللہ تعالیٰ نے اس اہم اصل کو گواہی اور علم کے ساتھ مشروط ومقرون فرمایا ہے:

[إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾]

یعنی: مگر جو حق یعنی (لا إله إلا الله) کی گواہی دیں اس طرح کہ انہیں اس کا علم بھی ہو۔

"لا اله الا الله" کی لفظی توضیح اور اس کا معنی

(لا إله إلا الله) یہ جملہ اسمیہ ہے، اس میں "لا" حرفِ نفی ہے، یہ "لا" نفیٔ جنس کا فائدہ دیتا ہے، اس قسم کی نفی از حد عموم کا فائدہ دیتی ہے، گویا (لا إله إلا الله) ایک ایسا جملہ ہے جس کا آغاز، نفیٔ عام سے ہوتا ہے اور اختتام اثباتِ خاص پر ہوتا ہے؛ کیونکہ "إلا الله" میں "إلا" اداۃِ حصر ہے۔ اب "لا إله" جو آغازِ جملہ ہے کی نفیٔ عام کا معنی یہی ہوگا کہ (اللہ تعالیٰ کے سوا) ہر شیٔ سے معبود ہونے کی

مطلق اور عام نفی، اور "إلا الله" جو اختتامِ جملہ ہے اور حصر کے سیاق میں ہے کا معنی یہی ہوگا کہ معبود صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس عظیم الشان کلمہ میں مندرج، نفیٔ عام اور اثباتِ خاص کے اس عقیدہ کی ایسی گواہی مطلوب ہے، جس میں انسان کا زبان کا اقرار، قلبی اعتراف اور بقیہ بدن کے تمام اعمال، اللہ رب العزت کی توحید پر قائم ہوں اور کہیں بھی شرک کا شائبہ تک نہ ہو۔

واضح ہو کہ کلمہ (لا إله إلا الله) میں "لا" نفیٔ جنس ہے، اور کلام میں جب یہ "لا" آئے گا تو اس کے اسم اور خبر دونوں کا ہونا ضروری ہے، اس جملہ میں إله "لا" کا اسم ہے، جبکہ اس کی خبر محذوف ہے، جو کہ "حقٌّ" ہے، تقدیرِ جملہ یوں ہوئی "لا إله حق إلا الله" اس کا معنی یہ ہوگا کہ کوئی حق معبود نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ۔

گویا یہ کلمہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگر معبودوں کے موجود ہونے کی نفی نہیں کر رہا بلکہ حق معبودوں کی نفی کر رہا ہے، گویا اس کائنات میں مشرکین نے مختلف معبود بنا رکھے ہیں، مگر ان میں سے کوئی معبودِ حق نہیں ہے بلکہ سب کے سب باطل ہیں، معبودِ حق صرف اللہ رب العزت ہے۔ یہ معنی قرآن حکیم نے ذکر فرمایا ہے:

[ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ][1]

یعنی: بے شک اللہ تعالیٰ ہی معبودِ حق ہے اور جن جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں قرآن پاک نے معبودانِ باطلہ کے موجود ہونے کا انکار نہیں کیا بلکہ ان کے حق ہونے کا انکار کیا ہے۔

ہماری اس تقریر سے ان لوگوں کا رد ہوتا ہے جو "لا" کی خبر محذوف "مَوْجُوْدٌ" قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ معبودانِ باطلہ بکثرت موجود ہیں، لہذا موجود کی تقدیر نافع نہ ہوگی، اصل مقصود تو ان موجود

---

[1] الحج: ۶۲

معبودوں کا ابطال ہے، جو کہ "حقؐ" کی تقدیر سے حاصل ہوگا اور سورۃ الحج کی مذکورہ آیت اس پر واضح دلیل ہے۔

"محمد رسول اللہ" کی گواہی اتباع کے بغیر مشکوک ہے

(محمد رسول اللہ) اسلام میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی گواہی کے بعد محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی ضروری ہے۔ یہاں بھی شہادت کا وہی مفہوم ہے جو کلمہ (لا إله إلا الله) کی شہادت کے ضمن میں ذکر ہو چکا ہے، چنانچہ (محمد رسول اللہ) کا صرف زبانی اقرار کافی نہیں ہے، بلکہ دل سے اعتراف اور شہادت بھی ضروری ہے، اس کے بعد انسان کے عمل میں بھی اس گواہی کا رنگ نمایاں دکھائی دے، اور وہ اس طرح کہ ہر عمل میں اس شخصیت کی اتباع کا رنگ نمایاں نظر آئے، جس کے رسول اللہ ہونے کا اقرار بھی کیا ہے اور دل سے اعتراف بھی۔

اگر عقیدہ و عمل میں محمد ﷺ کی اتباع مفقود یا متروک ہے، تو انہیں رسول اللہ ماننے کا معاملہ مشکوک دکھائی دے گا۔

قرآن حکیم نے تشکیل رسالت کا اصل مقصد اطاعت قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

[وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ][1]

یعنی ہم نے آپ سے قبل جتنے بھی رسول بھیجے سو اسی مقصد کیلئے کہ ان کی اللہ کے حکم سے اطاعت کی جائے۔

اس لئے قرآن مجید میں جابجا رسول کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ ایک مقام پر آپ کی اطاعت کو ہدایت کی شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، یعنی اگر آپ کی اطاعت ہوگی تو ہدایت ہے ورنہ گمراہی۔

---

[1] النساء:۶۴

[وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ][1]

قبولِ عمل میں بھی بنیادی شرط یہی ہے کہ وہ آپ کی اطاعت کے دائرے میں ہو، فرمان ہے:

[يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَلَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَكُمۡ ﴿۳۳﴾][2]

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور اپنے اعمال برباد نہ کرو۔

نتیجہ بالکل واضح ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، اگر عمل کے ساتھ موجود ہے تو وہ عمل مقبول ہے، اور اگر مفقود ہے تو وہ عمل مردود ہے۔

یہی نکتہ رسول کریم ﷺ کی مندرجہ ذیل دو احادیث سے حاصل ہوتا ہے:

(۱) من احدث فی أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد.[3]

یعنی: جو ہمارے دین میں کوئی نیا عمل جاری کرے گا وہ مردود ہوگا۔

(۲) من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد.[4]

یعنی: جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہمارا امر نہ ہو تو وہ مردود ہوگا۔

ایک باطل فکر کی تردید

واضح ہو کہ بعض لوگ جو شریعت کی روح اور سنت کی خوشبو سے محروم ہے یہ کہتے سنائی دیتے ہیں کہ قبولِ عمل کیلئے صرف عمل کرنے والے کی سچی طلب اور اچھی نیت ہی کافی ہے، لیکن یہ ایک محض بے کاری سوچ ہے، جس میں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں ہے۔

---

[1] النور:۵۴

[3] صحیح بخاری:۲۶۹۷

[4] صحیح مسلم:[illegible]

کیا اس صحابی کی طلب سچی نہ تھی اور نیت اچھی نہ تھی، جس نے نمازِ عید سے قبل اپنی قربانی کا جانور ذبح کرلیا تھا؟ کتب ِحدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اس کے اس عمل میں صرف اس کی نیک نیتی کارفرما تھی، اس نے نماز سے قبل اپنی قربانی کا جانور صرف اس لئے ذبح کیا کہ اس کا گوشت جلد از جلد پڑوس کے غریب صحابہ کرام تک پہنچ جائے۔

اس سے بہتر کوئی طلب ہوسکتی ہے؟ اب آیئے سنتے ہیں، دربارِ نبوت سے اس عمل کے بارے میں کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: (شاتك شاة لحم) تمہاری یہ بکری صرف گوشت کی بکری ہے، قربانی ہرگز نہیں ہوئی۔ مکمل قصہ صحیح بخاری ۵۵۵۶ اور صحیح مسلم ۱۹۶۱ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۱۰/ ۱۷) میں ابومحمد بن ابی جمرہ کی اس واقعہ پر تعلیق نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

وفيه أن العمل وإن وافق نية حسنة لم يصح إلا إذا وقع على وفق الشرع

اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ عمل خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے ادا ہو، اس وقت تک درست اور قابل قبول نہیں ہوسکتا جب تک شریعت یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق نہ ہو۔

اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ سنن دارمی میں مذکور ہے۔

اجتماعی ذکر کی بدعت کی تردید

أن عبدالله بن مسعود رضى الله عنه وقف على أناس فى المسجد متحلقين وبأيديهم حصى، يقول أحدهم : كبروا مائة، فيكبرون مائة، فيقول: هللوا مائة، فيهللون مائة، ويقول: سبحوا مائة، فيسبحون مائة، فقال: ما هذا الذى أراكم تصنعون؟ قالوا: يا أبا عبدالرحمن! حصى نعد به التكبير والتهليل والتسبيح،

قال: فعدوا سيئاتكم فأنا ضامن أن لا يضيع من حسناتكم شئ، ويحكم يا أمة محمد! ما أسرع هلكتكم! هؤلاء صحابة نبيكم ﷺ متوافرون، وهذه ثيابه لم تبل، وآنيته لم تكسر، والذى نفسى بيده! إنكم لعلى ملة هى أهدى من ملة محمد ﷺ أو مفتتحو باب ضلالة؟! قالوا: والله يا أبا عبدالرحمن! ما أردنا إلا الخير، قال: وكم من مريد للخير لن يصيبه

ترجمہ: صحابیٔ رسول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد میں کھڑے ہوکر کچھ لوگوں کا عمل دیکھ رہے تھے، جو حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے کنکریاں رکھی ہوئی تھیں، ایک شخص باآوازِ بلند کہتا: سو بار اللہ اکبر کہو، تو لوگ سو بار اللہ اکبر کہتے پھر وہ کہتا: سو بار لا إلہ إلا اللہ کہو، تو لوگ سو بار لا إلہ إلا اللہ کہتے، پھر وہ کہتا: سو دفعہ سبحان اللہ کہو، تو لوگ سو دفعہ سبحان اللہ کہتے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ تم کیا کرتے دکھائی دے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا اے ابوعبدالرحمن ہم ان کنکریوں پر تکبیر، تہلیل اور تسبیح شمار کر رہے ہیں۔

جناب عبداللہ نے فرمایا: بہتر ہے کہ تم اس کی جگہ اپنے گناہ شمار کرو جس پر میں ضمانت دینے کیلئے تیار ہوں کہ تمہارے کوئی نیکی ضائع نہ ہوگی۔

اے امت ِمحمد ﷺ! تم پر افسوس تم کس قدر جلدی برباد ہوگئے، نبی ﷺ کے صحابہ بکثرت موجود ہیں، ابھی آپ ﷺ کے کپڑے تک بوسیدہ نہیں ہوئے اور برتن تک نہیں ٹوٹے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یا تو تم ایک ایسے طریقے پر قائم ہوچکے ہو جو محمد ﷺ کے طریقے سے افضل اور زیادہ ہدایت یافتہ ہے اور یا پھر تم نے گمراہی کا دروازہ کھول دیا ہے۔

انہوں نے کہا: اے ابوعبدالرحمن! اللہ کی قسم ہماری نیت اور طلب خیر کے علاوہ کچھ نہیں، جناب عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا: کتنے ہی لوگ ہیں جن کی نیت اور طلب خیر ہوتی ہے، مگر

خیر انہیں ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔ (سنن دارمی ۱/ ۶۸-۶۹ اس اثر کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ (۲۰۰۵) میں وارد کیا ہے)

حضرات! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ صحابی رسول جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی سچی اور نیک طلب والی بات کو کس طرح رد فرمادیا، وجہ یہ تھی کہ ان کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے طریقہ مبارکہ سے ثابت نہیں تھا، جس سے واضح ہوا کہ ایک شخص کی طلب کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کا عمل مصطفی علیہ السلام کے طریقہ کے خلاف ہے تو وہ قطعی مردود اور ناقابل قبول ہے۔

''محمد رسول اللہ'' کی گواہی کا تقاضا

(أشهد أن محمدا رسول الله)

محمد ﷺ کے رسول اللہ ہونے کی گواہی، ہم سے بہت سے امور کا تقاضا کرتی ہے، مگر یہ مقام ء اسف ہے کہ جس قدر ان امور کی معرفت کی ضرورت واہمیت ہے، اسی قدر لوگ غفلت یا تغافل کا شکار ہیں۔

ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان امور کی تعمیل وتکمیل کے بغیر تعلق بالرسول کے تمام دعاوی کھوکھلے اور لایعنی ہیں۔ واللہ المستعان

ہم اتمام حجت کیلئے ان امور کا بیان ضروری سمجھتے ہیں، لہذا پیش خدمت کئے دیتے ہیں۔ شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ "شرح الأربعين النووية" میں اسی مقام پر ان امور کا تذکرہ فرماتے ہیں، جس کی تلخیص عرض خدمت ہے:

''محمد رسول اللہ ﷺ'' کی شہادت بہت سے امور کو متلزم ہے، (جن کے بغیر یہ شہادت قطعی غیر معتبر اور نامکمل تصور ہوگی)

① ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ ہر امرونہی اور ذکر کردہ ہر خبر کو سچا جان کر اس کی تصدیق کی جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

[إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ ﴿٢٣﴾] [1]

بلاشبہ وہ (محمد ﷺ) حق ہیں بالکل ویسے جیسے تم باتیں کرتے ہو۔

لہذا رسول اللہ ﷺ کی گواہی صرف اسی صورت قابل قبول متصور ہوگی جب آپ ﷺ کے کسی فرمان میں کسی قسم کا شک یا تردد نہ ہوگا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کا وہ فرمان صحت سند کے ساتھ ثابت ہو، دریں صورت اس کی تصدیق کرنا فرض ہوگا، خواہ اس کی توجیہ یا تعلیل سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

② ضروری ہے کہ آپ ﷺ سے ثابت ہر امر کا امتثال واتباع، بلا ریب وتردد موجود وقائم رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ] [2]

یعنی کسی مؤمن مرد یا عورت کے لائق نہیں ہے کہ اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) کوئی فیصلہ صادر کردیں اور وہ اپنی پسند لئے بیٹھے رہیں۔

ہم تو کہتے ہیں کہ یہ بھی غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آمدہ کسی امر کو سن کر یہ پوچھا جائے کہ یہ وجوب کیلئے ہے یا استحباب کیلئے؟ کیا کبھی کسی صحابی نے نبی ﷺ کے کسی امر کو سن کر یہ سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کا یہ امر برائے وجوب ہے یا استحباب؟ کبھی نہیں۔

وہ تو آپ ﷺ کے ہر فرمان کو حق وصدق جانتے ہوئے اس کے امتثال واتباع پر مستعد رہتے۔

ہم بھی یہی دعوت لوگوں کو پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جب آپ نے محمد ﷺ کی رسالت کی گواہی

---

[1] الذریات: ۲۳
[2] الاحزاب: ۳۶

دے دی تو اب کسی بھی حدیث کے پہنچنے کے بعد ایسا سوال نہ کرو کہ یہ برائے وجوب ہے یا استحباب؟ یا یہ قولِ امام کے موافق ہے یا مخالف؟ یا یہ برادری کے رسوم ورواج کے مطابق ہے یا معاکس؟

البتہ اگر کسی انسان سے نبی ﷺ کے کسی امر کے ترک کی کوتاہی سرزد ہوگئی تو اب وہ یہ سوال کرسکتا ہے کہ میں جو امر چھوڑ بیٹھا وہ برائے وجوب تھا یا استحباب؟ تاکہ اگر برائے وجوب تھا تو اس پر توبہ کرسکوں۔

منکرین حدیث کی تردید

③ ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جس چیز کی نہی وارد ہو اس سے کلیۃً احتراز اور اجتناب کرے، اور اس میں کسی قسم کا کوئی تردد کارفرما نہ ہو، جیسا کہ کچھ لوگ اپنی جان چھڑانے کیلئے یہ بہانہ تراشتے ہیں کہ یہ چیز حدیث میں تو ہے مگر قرآن مجید میں نہیں ہے۔

ان لوگوں پر واضح ہونا چاہئے کہ حدیث میں جو امر ونہی وارد ہے اس کی اتباع کا حکم قرآن ہی نے تو دیا ہے، کمافی قولہ تعالیٰ:

[وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ][1]

اور جو تمہیں رسول دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے باز آجاؤ۔

اس قماش کے لوگوں کی خبر ایک حدیث میں موجود ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

(لا ألفين احد كم على أريكته يأتيه الأمر من عندي فيقول ما أدري ما كان في كتاب الله اتبعناه)[2]

[1] الحشر: ۷
[2] سنن ابی داؤد: 7605، جامع ترمذی: 3662

یعنی میں تم میں ایسا شخص نہ دیکھوں جو انتہائی تکبر کے ساتھ اپنے تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو، اس کے پاس میرا کوئی امر (حدیث) آئے، اور وہ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہہ کر حدیث کو رد کردے کہ میں نہیں جانتا میں تو صرف جو کتاب اللہ میں ہے اس کی اتباع کرونگا۔

ایسا جہلاء کو یہ بات معلوم نہیں کہ ہر وہ بات جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آئے وہ قرآن ہی میں مذکور ہے؛ کیونکہ ہمیں (واتبعوہ) کہہ کر قرآن ہی نے آپ ﷺ کی مکمل پیروی کا مکلف ٹھہرایا ہے۔

④ آپ ﷺ کی رسالت کی شہادت کے تعلق سے ضروری ہے کہ آپ ﷺ کے فرمانِ گرامی قدر پر کسی بشر خواہ وہ کوئی بھی ہو، کا قول مقدم نہ کرے، کوئی بڑے سے بڑا امام یہ مقام نہیں رکھتا کہ اس کے قول کو رسالت مآب ﷺ کے فرمان پر مقدم کیا جائے۔

کیونکہ تم اور تمہارا امام اور دنیا کا ہر انسان رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا پابند ہے۔

[يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝۳۳][1]

کسی شخص کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث پیش کی جائے اور وہ جواب میں کہے کہ میرے فلاں امام کا قول تو اس کے خلاف ہے، یہ بات کتنی افسوس ناک اور ہیبتناک ہے، تمام مخلوقات میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے قول کا سیدالانبیاء والمرسلین کے فرمان سے معارضہ کیا جائے۔

حدیث کے مقابل قول امام پیش کرنیوالوں کیلئے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی وعید

اسی لئے ایک موقع پر جب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے لوگوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کی اور لوگوں نے شیخین یعنی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے قول سے معارضہ کرنا چاہا تو عبداللہ بن

[1] محمد: ۳۳

عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

(یوشك ان تنزل عليكم حجارة من السماء أقول قال رسول الله وتقولون قال ابوبكر وعمر)

یعنی عنقریب تم پر آسمان سے پتھر برس سکتے ہیں میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے اور تم جواب دیتے ہو کہ اس بارے میں ابوبکر وعمر نے یوں کہا ہے۔

غور کیجئے جن اماموں کی لوگ باتیں کرتے ہیں اور ان کے اقوال، احادیث رسول سے مقدم کرتے ہیں، بھلا ان کی سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے کیا نسبت ہے؟

⑤ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ کے بیان کردہ دین میں کوئی اضافہ نہ کرے، خواہ وہ اضافہ عقیدہ میں ہو یا عمل میں یا قول میں۔

ایسا ہر اضافہ بدعت کہلاتا ہے اور فرمانِ رسول ﷺ کے بموجب ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

بدعتی کوئی بھی ہو اس نے محمد رسول اللہ ﷺ کی شہادت کو پامال کر دیا؛ کیونکہ آپ ﷺ کی شریعت میں وہ چیز داخل کر دی جو آپ ﷺ نے بیان نہیں فرمائی۔ ایسے لوگ آپ ﷺ کے ساتھ حسن ادب کے تقاضے کیا پورے کر سکیں گے۔

⑥ جس طرح یہ ضروری ہے کہ آپ ﷺ کے دین میں کسی نئی چیز کو داخل یا شامل نہ کیا جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ﷺ کے حق میں کسی نئی چیز کو داخل یا شامل نہ کیا جائے۔

چنانچہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے یوم ولادت کی مناسبت سے مختلف مجالس یا احتفالات میلاد کا انعقاد کرتے ہیں، یہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے ایک اضافہ متصور ہوگا۔

تو جو لوگ آپ ﷺ کے بارے میں یا آپ ﷺ کے دین میں اپنی مرضی سے اضافہ کے

مرتکب ہوتے ہیں وہ (محمد رسول اللہ) کی شہادت میں صادق ہو سکتے ہیں؟

⑦ (محمد رسول الله) کی شہادت کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آپ کیلئے ربوبیت میں سے کوئی حصہ نہیں ہے، چنانچہ نہ تو آپ کو پکارا جائے نہ آپ سے استغاثہ کیا جائے۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔

البتہ اپنی زندگی میں آپ ﷺ جو چیز دینے پر قادر ہیں وہ آپ ﷺ سے طلب کی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی تقاضا ہے [قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ] [1] کہہ دیجئے میں اپنے نفس کیلئے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو یہ کہنے کا حکم دیا ہے: [قُلْ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝۲۱ قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۲] [2] کہہ دیجئے میں تمہارے لئے کسی نقصان یا بھلائی کا مالک نہیں ہوں اور کہہ دیجئے مجھے اللہ تعالیٰ سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا نہ میں اس کے علاوہ کوئی جائے پناہ پاتا ہوں۔

ان نصوص سے ان لوگوں کی گمراہی آشکارہ ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کو پکارتے ہیں یا رسول اللہ ﷺ سے استغاثہ کرتے ہیں۔

اولاً تو یہ دعا یا استغاثہ ان کیلئے بالکل نافع نہیں ہو سکتا، ثانیاً ان پر شرک کا حکم منطبق ہو جائے گا، اور معلوم ہے کہ شرک ظلم عظیم ہے جس کی قطعاً کوئی بخشش نہیں ہے۔

⑧ (محمد رسول الله) کی شہادت کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ کا احترام کیا جائے، یہ احترام اس قدر ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی آواز سے اونچی آواز میں

[1] الاعراف:۱۸۸

[2] ۲۲

بات کرنا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے (چہ جائیکہ آپ ﷺ کے فرمان پر کسی کی بات کو مقدم یاراجح قرار دے لیا جائے۔)

اسی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے امیر المؤمنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ یہ بھی گوارہ نہ فرماتے کہ کوئی آپ ﷺ کی قبر مبارک کے پاس اونچی آواز سے بات کرے، چنانچہ امیر المؤمنین نے دو افراد کو جوکہ طائف سے آئے تھے، نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس کھڑے اونچی آواز سے گفتگو کرتے سنا تو فرمایا: (لولا أنكما من أهل الطائف لأوجعتكما ضربا) یعنی اگر تم طائف سے نہ آئے ہوتے تو آج میں تمہاری ٹھکائی کر دیتا۔[1]

آپ ﷺ کی احادیث کے احترام کا یہ لازمی تقاضا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہے:

[يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲][2]

یعنی اے ایمان والو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نہ آپ سے اونچی آواز سے باتیں کرو جس طرح کہ تم آپس میں کرتے ہو ایسا نہ ہو کہ تمہارے تمام عمل اکارت چلے جائیں اور تمہیں احساس تک نہ ہو۔

احترام رسول ﷺ کا ایک عظیم الشان واقعہ

صحابہ کرام کی سیرت میں اس احترام کے مظاہر ثابت ہیں، چنانچہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ جنہیں نبی ﷺ کے خطیب ہونے کا شرف حاصل ہے اور جن کی آواز بہت بلند تھی، اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد اپنے گھر بیٹھ گئے اور دن رات رونا شروع کر دیا۔

نبی ﷺ جو اپنے صحابہ کی نماز میں موجودگی چیک کیا کرتے تھے، ثابت بن قیس کو کئی روز

[1] صحیح بخاری: 074

[2] الحجرات: ۲

موجود نہ پا کر اس کے متعلق پوچھتے ہیں، صحابہ نے جواب دیا کہ اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد سے وہ اپنے گھر میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور مسلسل رو رہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جاؤ انہیں لیکر آؤ، نبی ﷺ کے بلانے پر وہ آگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: (ما يبكيك يا ثابت؟) اے ثابت تم کیوں روتے ہو، ثابت نے جواب دیا: چونکہ میری آواز سب سے اونچی ہے تو مجھے خدشہ ہے کہ یہ آیت کریمہ میرے ہی بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس آیت کے آخر میں یہ بیان ہے کہ تمہاری تمام نیکیاں برباد ہوسکتی ہیں اور تمہیں اس کا علم بھی نہیں ہونے پائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے ثابت بن قیس کو تسلی دی اور اس موقع پر یہ بھی فرمایا: (أما ترضى أن تعيش حميدا وتقتل شهيدا وتدخل الجنة) کیا تمہیں یہ بات جان کر خوشی نہ ہوگی کہ تم قابل تعریف زندگی گذاروگے اور شہادت کی موت پاؤ گے اور قیامت کے دن جنت میں داخل کردیئے جائیں گے۔ (انتہی کلامہ ملخصاً)

ثابت بن قیس کی ساری زندگی سعادت کا مرقع رہی اور مسیلمہ کذاب کی فوجوں سے جہاد کرتے ہوئے شہادت کا تمغہ بھی سینے سے سجالیا اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے بموجب قیامت کے دن جنت میں بھی داخل ہوجائیں گے۔

سبحان اللہ یہ خوشخبری حدیث رسول اور آواز رسول کے احترام اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے حاصل ہوئی، تو وہ شخص کتنے عظیم رتبہ پر فائز ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی خشیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی اس طرح اتباع کرتا ہے کہ ان کے مقابلے میں کسی کا قول آجائے ٹھکرادیتا ہے، نیز اس اتباع میں خالصیت کے پہلو کو اس طرح ملحوظ رکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دین میں کسی بدعت کا ارتکاب نہیں کرتا۔

للہ الحمد والمنۃ کہ اہل الحدیث اس انتہائی مبارک منہج پر فائز ہیں، ان کے دلوں میں احادیث رسول کا احترام اور ان کے عقائد واعمال میں احادیث رسول کی اتباع وامتثال کا پورا پورا رنگ

موجود ہے، پھر اس اتباع پر عقیدۃً وعملاً ودعوۃً اس طرح قائم ہیں کہ کسی قسم کی بدعت یا اہل بدعت سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہے۔

ان شاء اللہ یہ منہج صافی سعادتِ دارین کا سبب بنے گا اور قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کے مبارک حوض پر ورود کا ذریعہ ہوگا؛ کیونکہ حوضِ کوثر سے اہل بدعت کو دھتکار دیا جائے گا۔ اور نبی ﷺ صاف فرمادینگے: سحقا سحقا لمن غیر بعدی۔ میرے بعد میرے دین میں بدعات داخل کرکے تبدیلیاں کرنے والوں کو مجھ سے دور کردیا جائے۔ واللہ المستعان۔

”محمد رسول اللہ“ کی گواہی کے چند مزید تقاضوں کا بیان

واضح ہو کہ (محمد رسول اللہ) کی شہادت کے چند مزید لازمی تقاضوں کا ذکر ضروری ہے، جنہیں ہم سابقہ ترقیم کے تسلسل کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

⑨ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دینے والوں پر ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی اختلاف یا تنازعہ کے بھنور میں پھنس جائیں تو خاتمہ اختلاف کیلئے ان کا مرجع صرف رسول اللہ ﷺ ہوں کوئی دوسرا نہ ہو خواہ وہ کتنا بڑا امام یا محدث یا فقیہ ہو۔

افسوس ہے کہ لوگوں کی اکثریت اور بالخصوص اصحابِ مذاہب اس نکتہ پر توجہ نہیں دیتے حالانکہ یہ اللہ اور اس کے رسول کا وہ امر ہے جس کی پیروی یا عدمِ پیروی کے ساتھ ایمان یا کفر کو مربوط کیا گیا ہے۔

[فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ][1]

پس اگر تم کسی شیٔ میں اختلاف کر بیٹھو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹادو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

[1] النساء: ۵۹

نیز فرمایا: [فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ]
قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ جب تک آپ کو اپنے اختلافات میں حَکم نہیں مان لیتے اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتے۔

⑩ (محمد رسول اللہ) کی شہادت کا ایک اہم اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ سے دل وجان سے ایسی محبت کی جائے جو دنیا کی ہر شیٔ کی محبت سے زیادہ ہو، یہ بات بھی بندے کے ایمان کے ساتھ مربوط ومنسلک ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (لایؤمن احد کم حتی أکون أحب إلیہ من والدہ وولدہ والناس أجمعین)
یعنی تم اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک مجھے اپنے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ بنالو۔

رسول اللہ (ﷺ) کی محبت کے تقاضے

اس محبت کی تکمیل کیلئے ہر اس شیٔ سے محبت کرنی پڑے گی جس جس شیٔ سے رسول اللہ ﷺ کو محبت ہے، مثلاً: قرآن وحدیث، صحابہ کرام، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، آپ ﷺ کی ازواج امہات المؤمنین اور آپ ﷺ کی دیگر آل واولاد وغیرہ۔

اسی محبت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کے مبارک مشن سے محبت کی جائے، اس مبارک مشن کا آغاز (قولو لا إلہ إلا اللہ) یعنی دعوتِ توحید سے ہوا، جو پوری زندگی جاری رہا اور ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے طریقہ مبارکہ کی اتباع کی تلقین جاری رہی، گویا توحید وسنت سے محبت، آپ ﷺ سے محبت کے لازمی تقاضوں میں شامل ہے۔

اسی محبت کا لازمی تقاضا آپ ﷺ پر کثرت سے درود وسلام پڑھنا ہے۔ جس کا حکم قرآن پاک میں مذکور ہے:

[إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ

وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴿۵۶﴾][1]

بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں سواے ایمان والو! تم بھی نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجا کرو۔

اس درود و سلام کی فضیلت کتب احادیث میں وارد ہے، نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(من صلی علی واحدة صلی الله علیه بها عشرا)

جس شخص نے مجھ پر ایک بار درود بھیجا، اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمتیں نازل فرمائے گا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد گرامی ہے:

(أقربكم منی منزلة يوم القيامة أكثركم علی صلاة)

قیامت کے دن باعتبارِ مرتبہ وہ شخص میرے سب سے زیادہ قریب ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھنے والا ہوگا۔

اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کے نام نامی اور ذکر مبارک کو سن کر درود نہ پڑھنے والے کو بخیل کہا گیا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھتکارے جانے کی وعید کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] الاحزاب:۵۶

اسلام کا دوسرا رکن: اقامتِ صلاۃ

دوسرا رکن اسلام (وتقيم الصلاة) کے الفاظ سے مذکور ہے، جس کا معنی: نماز (سیدھی کرکے درست طریقہ سے) قائم کرنا ہے۔

نماز کی اہمیت

توحید و رسالت کی گواہی کے ذکر کے بعد، نماز کا ذکر، اس کی اہمیت کی انتہائی بین دلیل ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اسے (عمود الاسلام) فرمایا ہے، (عماد الدین) کے الفاظ بھی وارد ہیں، عماد یا عمود سے مراد خیمے کا وہ ستون ہے، جو وسطِ خیمہ میں نصب ہو کر پورے خیمے کو اٹھائے رکھتا ہے، جس کے گرنے سے، خیمہ منہدم ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نماز کو مسلم اور کافر کے مابین فرق اور تمیز کی اساس قرار دیا ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے بتلایا ہے کہ احکام دین میں، نماز سب سے آخر میں مفقود ہوگی، جبکہ ایک اور حدیث کے مطابق، قیامت کے دن اعمال میں سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا۔

نماز کی اہمیت کیلئے یہی بات انتہائی کافی اور شافی ہے کہ امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ جب دنیا سے رحلت فرما رہے تھے تو آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: (الصلاة وما ملكت أيمانكم) یعنی: نماز قائم رکھنا اور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ پر جانکنی کا عالم تھا اور آپ کے ہونٹوں پر یہ

الفاظ جاری تھے: (الصلاۃ وما ملکت أیمانکم)

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہونے والا آخری جملہ یہی تھا: (الصلاۃ وما ملکت أیمانکم)

یہ بات بھی اہمیت نماز کی زبردست دلیل ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات، اپنے رسول کو آسمانوں پر بلا کر فرض فرمایا، یہ تمیز کسی اور فریضہ کو حاصل نہیں ہے۔

روزِ قیامت جب جہنمیوں سے ان کے جہنم میں جانے کا سبب معلوم کیا جائے گا تو وہ کہیں گے:

[قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾] [1]

یعنی: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔

تبھی تو قرآن نے مؤمنین کا پہلا وصف، ادائیگیٔ نماز ذکر فرمایا ہے:

[قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿٢﴾] [2]

یعنی: مومنین فلاح پا گئے، وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اختیار کرنے والے ہیں، بلکہ اس سیاق میں آخری وصف بھی حفاظت نماز ہے فرمایا:

[وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩﴾] [3]

یعنی: مومن وہ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

یہ سورہ (المؤمنون) کا مقام ہے، جبکہ سورہ (المعارج) میں بھی اسی اسلوب سے نماز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے اوصاف ذکر کئے گئے جو جہنم سے محفوظ رہیں گے، پہلا وصف:

[اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾] [4]

---

[1] المدثر:۴۳
[2] المؤمنون:۲،۱
[3] المؤمنون:۹
[4] المعارج:۲۳،۲۲

یعنی: سوائے نمازیوں کے، جو اپنی نمازوں پر ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔

سورہ (المعارج) کے اسی سیاق کے آخر میں فرمایا:

[وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٣٤﴾] [1]

یعنی: مومن وہ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

گویا متقین کے اوصاف کے تذکرہ میں پہلا وصف، حفاظت نماز اور آخری وصف بھی، حفاظت نماز ذکر ہے، جو یقیناً نماز کی اہمیت کی دلیل ہے۔

آدابِ نماز جن کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے

اس اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ادائیگیٔ نماز میں ان تمام امور کا مکمل لحاظ رکھا جائے، جن کی شریعت میں تاکید وارد ہے، مثلاً: ادائیگیٔ نماز میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کی اتباع، حفاظت اخلاص، حفاظت اِوقات، باجماعت ادا کرنا، حضورِ قلبی اور خشوع وخضوع کا مظاہرہ وغیرہ۔

جہاں تک ادائیگیٔ نماز میں رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ مبارکہ کے امتثال واتباع کا تعلق ہے تو یہ نکتہ انتہائی اہم اور ضروری ہے، جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[حٰفِظُوْا عَلَي الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۤ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾] [2]

یعنی: حفاظت کرو نمازوں کی اور (بالخصوص) نماز عصر کی اور کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلئے فرمانبرداری کرتے ہوئے، اگر تم پر خوف کی کیفیت طاری ہو تو نماز پڑھو چلتے ہوئے یا سوار، پھر جب تم امن میں آجاؤ تو ذکر کرو اللہ کا (یعنی نماز پڑھو) جس طرح اس نے تمہیں سکھا دیا ہے، وہ جو تم نہیں جانتے تھے)

---

[1] المعارج:۳۴
[2] البقرۃ:۲۳۹،۲۳۸

یہ آیت کریمہ دلالت کر رہی ہے کہ نماز، اللہ تعالیٰ کے سکھائے ہوئے طریقہ کے مطابق ادا کرنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طریقۂ نماز کی تعلیم، اپنے پیغمبر ﷺ کی احادیث کے ذریعے دے دی ہے، گویا یہ آیت کریمہ جس طرح ادائیگی نماز میں طریقۂ رسول ﷺ کی پیروی کے وجوب کی دلیل ہے، اسی طرح اس بات نشاندہی بھی کر رہی ہے کہ حدیث رسول ﷺ بھی وحی الٰہی ہے، ورنہ پورے قرآن میں طریقۂ نماز کی تعلیم کہیں نہیں ملتی۔

ادائیگی نماز میں، رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ مبارکہ کی اتباع کی فرضیت، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے بھی حاصل ہوتی ہے: (صلوا كما رأيتموني أصلي) [1] یعنی: ضروری ہے کہ تم بالکل ویسی ہی نماز پڑھو، جیسی مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے، ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اس کی نماز کا ایک عمل (عدم اطمئنان واعتدال) اپنے طریقۂ مبارکہ کے خلاف پایا، تو اسے حکم دیا: (ارجع فصل فإنك لم تصل) یعنی: لوٹ جاؤ اور دوبارہ نماز پڑھو؛ کیونکہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔
ایسا تین بار ہوا، پھر اس شخص نے رسول اللہ ﷺ سے، صحیح طریقہ سکھانے کی استدعا کی، تو آپ ﷺ نے اسے طریقۂ نماز کی تعلیم فرمائی۔ [2]

سلف صالحین، صحابہ کرام بھی اس مسئلہ کی حقیقت واہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے، لہٰذا وہ بھی جب کسی شخص کو خلافِ طریقۂ رسول ﷺ نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے، تو اسے نماز لوٹانے کا حکم دیتے اور صحیح طریقہ کی تعلیم دیا کرتے، جیسا کہ صحیح بخاری میں جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ ملتا ہے کہ انہوں نے حجاج بن ایمن کو خلافِ سنت نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، تو اسے فارغ ہونے کے بعد فرمایا: (أعد صلاتك) یعنی: اپنی نماز لوٹاؤ۔

---

[1] صحیح بخاری
[2] صحیح بخاری

حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک بزرگ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، پوچھا: (منذ كم تصلي هذه الصلاة؟) یعنی: یہ نماز کب سے پڑھ رہے ہو؟ اس نے جواب دیا: چالیس سال سے، فرمایا: (ما صليت) تم نے (چالیس سال سے) کوئی نماز نہیں پڑھی۔ مزید فرمایا: (لومت على هذا لمت على غير فطرة محمد ﷺ) یعنی: اگر یہی نماز پڑھتے پڑھتے تمہاری موت آگئی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے دین پر نہیں ہوگی۔ [1]

یہ تمام نصوص اس امر کے مقتضی ہیں کہ نماز، جو دین اسلام کا ستون ہے اور جس کی بابت روزِ قیامت سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کو حساب دینا ہے کی حفاظت، صرف رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے اتباع کے ذریعے ہی ممکن ہے، اس سلسلے میں کسی امام ومرشد یا باپ دادوں کے طریقہ کی پیروی قطعاً کام نہیں آئے گی، کتبِ فقہ کے وہ مسائل جو کتاب وسنت سے متصادم ہیں، بری طرح ناکام ہیں اور اپنے پیروکاروں کو ناکامی کی انتہائی خطرناک دلدل میں دھکیل دینے والے ہیں۔
والعیاذ باللہ۔

حضرات! ادائیگی نماز بلکہ ہر عمل کی قبولیت میں اتباع رسول ﷺ کا انتہائی اہم کردار ہے، دوسرا اہم کردار حفاظت نیت یعنی اللہ تعالیٰ کیلئے اخلاص پیدا کرنا ہے؛ لقولہ تعالیٰ:

[وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ] [2]

یعنی: (تمام اولین وآخرین کو) صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى....) [3]

---

[1] صحیح بخاری، مسند احمد
[2] البینة: 5
[3] صحیح بخاری

یعنی: ہر عمل کی صحت وقبولیت کا مدار انسان کی نیت ہے، اور ہر شخص کو اس کے عمل سے صرف وہی کچھ ملے گا، جو وہ نیت کرے گا......

لہٰذا نماز، جس کا حساب سارے اعمال پر مقدم ہے کی قبولیت کیلئے اتباعِ سنت کے ساتھ ساتھ حفاظتِ نیت از حد ضروری ہے، ان دو شرائط کے بغیر یہ عظیم عمل، محض بے کار ہے۔

واللہ المستعان۔

ooooo

نماز باجماعت کی اہمیت

مردوں کیلئے نماز، مسجد میں باجماعت ادا کرنا ضروری ہے : کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے:

(إن اثقل صلاة على المنافقين صلاة العشاء وصلاة الفجر ،ولو يعلمون ما فيهما لأتوهما ولو حبوا، ولقد هممت أن آمر بالصلاة فتقام، ثم آمر رجلا فيصلي بالناس ،ثم أنطلق معي برجال معهم حزم من حطب إلى قوم لا يشهدون الصلاة فأحرق عليهم بيوتهم بالنار)[1]

یعنی: بے شک منافقین پر سب سے بھاری دو نمازیں ہیں: فجر اور عشاء، اور اگر وہ جان لیں کہ ان دونمازوں کا کتنا اجر وثواب ہے تو انہیں ادا کرنے کیلئے ضرور آئیں، خواہ گھٹنوں کے بل آنا پڑے۔ اور میں نے یہ ارادہ کرلیا تھا کہ نماز قائم کرنے کا حکم دوں اور ایک شخص کو جماعت کرانے پر مأمور کردوں، اور پھر کچھ لوگوں کو، جن کے پاس ایندھن کے گٹھے ہوں، اپنے ساتھ لیجاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگادوں جو نماز باجماعت کیلئے حاضر نہیں ہوتے۔

ممکن ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارادے پر عملی جامہ اس لئے نہ پہنایا ہو کہ گھروں

[1] بخاری ومسلم

میں عورتیں اور بچے بھی ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

صحیح مسلم میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول مروی ہے:

جس شخص کی چاہت ہو کہ وہ کل، اللہ تعالیٰ کو اپنے سچے اسلام کے ساتھ ملے تو وہ ان نمازوں کی حفاظت کرے، جہاں بھی ان کی ندادی جائے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو امورِ ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے اور نمازیں بھی امورِ ہدایت میں سے ہیں، اگر انہیں (اس متخلف شخص کی طرح) اپنے گھروں میں ادا کرو گے، تو تم اپنے نبی کی سنت کے ترک کے مرتکب قرار پاؤ گے اور اگر تم نے اپنے نبی کی سنت کو چھوڑا تو گمراہ ہو جاؤ گے، اور جو شخص باوضوء اپنے گھر سے نکلتا ہے اور مسجد کا رُخ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کیلئے ہر قدم کے بدلے ایک نیکی لکھ دیتا ہے، اور ایک درجہ جنت میں بلند کردیتا ہے، اور اس کا ایک گناہ جھاڑ دیتا ہے، ہمارے دور میں جماعت سے وہی شخص پیچھے رہا کرتا تھا جو اپنے نفاق میں جانا پہچانا ہوتا تھا، جبکہ (اصحاب رسول ﷺ) کا یہ عالم ہوتا تھا کہ مرض کی صورت میں ایک شخص کو دو افراد اس کے پاؤں کے بل گھسیٹ کر لاتے اور جماعت کی صف میں کھڑا کردیتے۔[1]

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: جب ہم کسی شخص کو عشاء اور فجر کی نماز میں مسجد میں نہ پاتے تو اس کے بارہ میں بدگمانی کا شکار ہوجاتے۔[2]

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک نابینا شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور اپنے نابینا ہونے کا عذر پیش کیا، نیز کہا کہ میرے پاس کسی ایسے راہبر کا انتظام بھی نہیں ہے جو مجھے مسجد لاسکے، رسول اللہ ﷺ نے اسے گھر نماز پڑھنے کی رخصت دے دی، جب وہ شخص جانے لگا تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر پوچھا: (هل تسمع النداء بالصلاة؟) کیا تم اذان کی آواز سنتے

[1] صحیح مسلم

[2] مستدرک حاکم

ہو؟اس نے کہا: جی ہاں،تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:(فأجب) پھر تو ضروری ہے کہ تم اذان کے جواب میں مسجد پہنچو (اور باجماعت نماز ادا کرو)

نماز باجماعت کی اہمیت اس بات سے بھی اجاگر ہوتی ہے کہ میدانِ جہاد میں جہاں دشمن سامنے کھڑا ہے اور اس کا حملہ آور ہونا متوقع ہے،اور جسے شریعت نے حالتِ خوف مانا ہے،وہاں بھی جماعت قائم کرنے کا حکم ہے (جس کی متعدد صورتیں احادیث میں وارد ہیں) حالتِ خوف میں جماعت سے نماز پڑھنے کا حکم قرآن میں مذکور ہے:

[وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ][1]

✪✪✪✪✪

نمازوں کیلئے وقت کی پابندی کی اہمیت

ادائیگی نماز کیلئے وقت کی پابندی بھی ضروری ہے؛ بقولہ تعالیٰ:

[اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝۱۰۳]

بے شک نماز مؤمنین پر مقررہ اوقات میں ادا کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں،جبکہ آپ سے سب سے افضل عمل کی بابت پوچھا گیا،تو ارشاد فرمایا:(الصلاۃ لوقتھا) یعنی وقت پر نماز پڑھنا۔ایک حدیث میں (لأول وقتھا) بھی وارد ہے،یعنی اول وقت میں نماز ادا کرنا سب سے افضل عمل ہے۔

فرضیتِ نماز کے فوراً بعد جبریل امین علیہ السلام نے تشریف لاکر رسول اللہ ﷺ کو ہرنماز کے اول اور آخر وقت کی تعلیم دے دی تھی،تفصیلات کتبِ حدیث میں موجود ہیں،انہیں پڑھ کر ہرنماز کے وقت کی حفاظت کی جائے،بلکہ ہرنماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے۔

[1] النساء:۱۰۲

احادیث مبارکہ سے ہر نماز کے اول وقت کی کوئی نہ کوئی اہمیت وفضیلت ثابت ہے،علی سبیل المثال،فجر اور عصر کے وقت کے تعلق سے،احادیث ملاحظہ کرلی جائیں،ایک اہم ترین فضیلت کی ہم نشاندہی کئے دیتے ہیں،اور وہ یہ کہ یہ دونوں اوقات،رات اور دن کے فرشتوں کی ڈیوٹیوں کی تبدیلی کے ہیں،دن کی ڈیوٹی پر مامور فرشتے،فجر کے وقت حاضر ہوتے اور عصر کے وقت اپنے رب کی طرف لوٹتے ہیں،اور رات کی ڈیوٹی پر مامور فرشتے،عصر کے وقت حاضر ہوتے ہیں اور فجر کے وقت،اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرشتوں کی ان دونوں جماعتوں سے پوچھتا ہے:(کیف ترکتم عبادی؟) تم میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟ فرشتے جواب دیتے ہیں:(أتیناھم وھم یصلون وترکناھم وھم یصلون) جب ہم ان کے پاس گئے تھے تو وہ نماز ادا کررہے تھے اور جب ہم انہیں چھوڑ کر آئے تو اس وقت بھی وہ نماز ادا کررہے تھے۔

اسی طرح نمازِ ظہر،اس کے اول وقت میں ادا کرنے کی اہمیت یہ ہے کہ زوالِ آفتاب کے فوراً بعد آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔[1]

لہٰذا نمازِ ظہر کی اول وقت میں ادائیگی،ان دروازوں سے نزولِ رحمت کا سبب بنے گی۔

✪✪✪✪✪

نماز میں خشوع وخضوع کی اہمیت وتاکید

شریعت نے نماز کے تعلق سے توجہ اور حضورِ قلبی کی تلقین بھی فرمائی ہے،نیز خشوع وخضوع کی حفاظت کی تاکید بھی وارد ہے اور فضیلت بھی: قال اللہ تعالیٰ:

[قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲][2]

[1] طبرانی کبیر

[2] المؤمنون:۲،۱

تحقیق مومنین فلاح پاگئے، جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں۔

(کان رسول اللہ ﷺ یصلی وفی صدرہ أزیز کأزیز المرجل من البکاء)

یعنی: رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھتے تو رونے کی وجہ سے آپ کے سینے سے ہنڈیا کے جوش مارنے جیسی آوازیں آیا کرتی تھیں۔

ایک حدیث میں اس نماز کی فضیلت وارد ہے جس میں انسان اپنے چہرے اور دل کی یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو (یقبل علیهما بوجهه وقلبه) جبکہ ایک حدیث میں (لایحدث فیهما نفسه) بھی وارد ہے۔ اس توجہ، یکسوئی اور خشوع وخضوع کی حفاظت کی اہمیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر کثرت سے شیطانی وساوس وارد ہورہے ہوں تو نماز کے دوران ہی تفل (ہلکا سا لعابِ دہن تھتھکارنا) کیا جائے، پھر شیطان سے تعوذ کیا جائے، تاکہ وساوس کا غلبہ ختم ہو اور تفل وتعوذ کے عمل سے شیطان ذلیل ہو اور بندہ اپنی نماز کی توجہ بحال کرنے میں کامیاب ہوجائے۔

بعض علماء نے ایسی نماز کو فاسد قرار دیا ہے جس میں ایک شخص عمداً پورے تسلسل کے ساتھ کسی ایک نکتہ پر غور وخوض کرتا رہے۔

لیکن وہ شخص انتہائی سعادت اور اجرِ عظیم کا مستحق ہوگا، جس پر اگر نماز میں خیالات وارد ہوں اور وہ انہیں ٹالنے اور دھتکارنے کی جدوجہد میں مصروف رہے، تاکہ حضورِ قلبی اور توجہ کو قائم رکھ سکے۔ یقیناً یہ عمل مجاہدہ کہلائے گا اور اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانِ مبارک منطبق ہوگا: (المجاهد من جاهد نفسه) اصل مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے۔ تو ان وارد ہونے والے وساوس کو دفع کرنا اور اپنے دھیان کو اپنی نماز کی جانب مبذول کرنا، مجاہدہ ہی قرار پائے گا۔

حفاظت نماز کے تعلق سے ہماری تاریخ، سلف صالحین کے زریں واقعات سے بھری پڑی ہے، تاریخ کے ان اوراق کو ضرور دیکھا جائے تاکہ سیرتِ سلف صالحین، ہماری نمازوں کی اصلاح اور سچے اہتمام کا ذریعہ بن جائے۔ اور یہ عظیم عمل ہمارے میزانِ حسنات کیلئے مقبول ومحفوظ بن جائے۔

نماز پروردگار سے ہم کلامی کا باعث

یہ بات معلوم ہے کہ یہ وہ واحد عمل ہے جس کے ذریعے بندہ دن رات کے متعدد اوقات میں اپنے پروردگار سے شرف ہم کلامی حاصل کرتا ہے۔ جس کا ذکر احادیث میں موجود ہے۔

چنانچہ بندہ جب سورہ الفاتحہ کی تلاوت کرتا ہے (جسے نماز میں پڑھنا فرض ہے اور جس کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں ہوتی) تو اس کی ہر آیت کی تلاوت پر اللہ تعالیٰ باقاعدہ جواب دیتا ہے:

بندہ جب اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: (حمدنی عبدی) یعنی میرے بندے نے میری تعریف کردی، بندہ جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: (اثنی علی عبدی) میرے بندے نے میری ثناء بیان کردی، بندہ جب مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: (مجدنی عبدی) میرے بندے نے میری بزرگی بیان کردی، بندہ جب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: (هذا لعبدی ولعبدی ماسأل) یعنی یہی عقیدہ میرے بندے کے لائق ہے، اب میرا بندہ جو سوال کرے گا عطا کروں گا۔

بندہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے: (هذا لعبدی ولعبدی ماسأل) یعنی یہی سوال میرے بندے کو زیب دیتا ہے، میرا بندہ اور بھی جو سوال کرے گا، عطا کروں گا۔[1]

یہ شرفِ ہم کلامی صرف نماز کو حاصل ہے، دوسرے کسی عمل کو نہیں۔

تو پھر یہ نکتہ مزید پختہ ہوگیا کہ ہم اس عظیم عمل کی شریعت کی ہدایات کے مطابق حفاظت کریں، اور پوری کوشش کے ساتھ اس عمل کو مسنون طریقہ سے ادا کریں۔

مسنون طریقہ سے مسلسل ادا ہونے والا یہ عمل، ہمارے ظاہر و باطن کو معصیتوں کی کالک سے یوں پاک وصاف کر دے گا، جیسے کوئی شخص دن میں پانچ بار نہر کے شفاف پانی سے غسل کرے۔

کیا ہم اس عمل کو ضائع کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم محض ذاتی فرقہ واریت یا آباء و اجداد کی محبت کی خاطر، رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ مبارکہ سے روگردانی کر کے، اُن کے طریقوں کو اپنا کر اپنی نمازوں کو برباد کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ واللہ ولی التوفیق۔

نمازوں میں غفلت برتنے والوں کیلئے شدید ترین قرآنی وعید

جس شریعت نے صحیح طریقہ سے نماز کی ادائیگی کے فضائل ومحاسن کا انبار لگا دیا ہے، اسی شریعت نے اسی نماز کی بناء پر یہ مژدۂ روح فرسا سنا دیا ہے:

[فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝][1]

یعنی: بربادی ہو بعض نمازیوں کیلئے، جو اپنی نمازوں سے غفلت کا شکار ہیں، جو دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں۔

غفلت، ترکِ نماز کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے اور اس کا دوسرا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ نمازیں تو ادا کرتے ہیں، لیکن مصطفی علیہ الصلاۃ والسلام کے طریقۂ مبارکہ سے غافل یا متغافل ہیں، اس قدر کہ غیروں کے طریقوں کو اپنے نبی کے طریقہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] الماعون: ۱۔۔۔۳

اسلام کا تیسرا رکن، ادائیگیٔ زکاۃ

اسلام کا تیسرا رکن (وتؤتی الزکاۃ) یعنی: زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

زکوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ ہر وہ مال جسے شریعت نے ادائیگیٔ زکوٰۃ کیلئے منتخب کیا ہے، اس میں سے مقررہ حصہ مستحقین کو ادا کر دیا جائے، یعنی شریعت مطہرہ نے جس مال کا جو حصہ بطورِ ادائیگیٔ زکوٰۃ فرض کیا ہے وہ پوری امانت داری کے ساتھ کسی کمی کے بغیر ادا کر دیا جائے۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مالداروں کے مال میں سے، فقراء کا حصہ زکوٰۃ کہلاتا ہے۔

زکاۃ کن اموال میں فرض ہے

جن اموال میں سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے، ان کی چار اقسام ہیں:

① نقدی: اس سے مراد سونا، چاندی یا ان کے قائم مقام چیزیں ہیں، مثلاً: کرنسی، خواہ وہ نوٹوں کی شکل میں ہو یا سکوں وغیرہ کی۔

② چوپائے، مثلاً: اونٹ، گائے اور بکری۔

③ زمین کی پیداوار، مثلاً: پھل یا اناج وغیرہ۔

④ سامانِ تجارت، اس سے مراد وہ سامان ہے جو خرید یا فروخت کیلئے رکھا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ جو چیزیں انسان کی ملکیت میں ہوں، ان میں اگرچہ زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن بطورِ صدقہ دی جا سکتی ہیں، صدقہ کا باب انتہائی وسیع ہے اور یہ عمل بہت زیادہ موجب اجر ہے۔

فرضیت زکوٰۃ کے حوالے سے یہ فرمان بار بار ذکر ہوتا ہے:

[وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ]١

یعنی: اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

یہ آیت کریمہ اس امر کی متقاضی ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے اور صاحب مال پر اس تعلق سے مسئولیت اور ذمہ داری مستقل قائم رہتی ہے۔

زکاۃ کی اہمیت

زکوٰۃ کی اہمیت کی یہی دلیل کافی ہے کہ اسے کتاب وسنت میں نماز کے قرین کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اور یہ ذکر انتہائی تکرار کے ساتھ وارد ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ]٢

ترجمہ: ہاں اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہوجائیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو تم ان کی راہیں چھوڑ دو۔

نیز فرمایا:

[فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ]٣

ترجمہ: اب بھی اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز کے پابند ہوجائیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں، تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

نیز فرمایا:

[وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڏ حُنَفَاۗءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ]٤

١المزمل:٢٠
٢التوبة:٥
٣التوبة:١١
٤البينة:٥

ترجمہ: انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اسی کیلئے دین کو خالص رکھیں۔ ابراھیم حنیف کے دین پر اور نماز کو قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیتے رہیں یہی ہے دین سیدھی ملت کا۔

مصارفِ زکاۃ کا بیان

قرآن مجید نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف مقرر کیئے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭفَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ]١

ترجمہ: صدقے صرف فقیروں کیلئے ہیں اور مسکینوں کیلئے اور ان کے وصول کرنے والوں کیلئے اور ان کیلئے جن کے دل پر چائے جاتے ہوں اور گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کیلئے اور اللہ کی راہ میں اور راہرو مسافروں کیلئے، فرض ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔

مذکورہ آیات قرآنی سے واضح ہوگیا کہ زکوٰۃ، نماز کی قرین ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں عمل باہم مربوط ہیں، چنانچہ اگر کوئی شخص نماز تو ادا کرے لیکن زکوٰۃ نہ دے، یا زکوٰۃ تو ادا کرے لیکن نماز کا تارک ہو تو اس کی تمام تر سعی لاحاصل ہوگی۔

مانعین زکاۃ کے متعلق ابوبکر صدیق t کا انتہائی سخت مؤقف

سلف صالحین ان دونوں فریضوں کے مابین تفریق، انتہائی معیوب قرار دیتے تھے، امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں جب لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو آپ نے فرمایا تھا: (واللہ لأقاتلن من فرق بین الصلاۃ والزکاۃ) یعنی: اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور لڑونگا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کھڑی کردی ہے۔

١التوبة:٦٠

ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ اپنے اس عظیم فہم کے مطابق اس موقف پر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے، ابتدائے امر میں آپ تنہا تھے، پھر دیگر صحابہ کرام کو بھی اس موقف پر شرحِ صدر حاصل ہوگیا۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس عمل وعزیمت کو دیکھ کر ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:

(واللہ الذی لا إلہ إلا ھو لولا ابوبکر ما عبداللہ)[1]

یعنی: اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں ہے اگر ابوبکر نہ ہوتے تو آج اللہ تعالیٰ کی (مکمل) عبادت نہ ہوپاتی۔

خلیفہ اول کے اس فرمان سے زکوٰۃ کے نماز کا قرین ہونے کا معنی اور حقیقت خوب عیاں ہوجاتی ہے۔

اہمیت زکوٰۃ کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ادائیگی زکوٰۃ کی باقاعدہ بیعت بھی لیا کرتے تھے، چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم فرمایا ہے: (باب البیعة علی إیتاء الزکاۃ) یعنی: زکوٰۃ دینے پر بیعت لینا۔

اس باب کے تحت جناب جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی ہے:

(بایعنا النبی ﷺ علی إقام الصلاۃ وایتاء الزکاۃ والنصح لکل مسلم)[2]

یعنی: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر نماز ادا کرتے رہنے، زکوٰۃ دیتے رہنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیرخواہی اپنائے رکھنے کی بیعت کی۔

زکوٰۃ ایک کثیر المنافع فریضہ

زکوٰۃ ایک بہت ہی کثیر المنافع فریضہ ہے، اگر شریعت مطہرہ علی صاحبہا الف الف تحیۃ میں مذکور نظامِ زکوٰۃ دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ ادائیگی زکوٰۃ سے فقراء مستفید ہوتے ہیں، لیکن

[1] شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۳/۳۹۲
[2] صحیح بخاری

مالدار لوگ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، کسی بڑے نقصان میں مبتلا نہیں ہوتے؛ کیونکہ بہت زیادہ مال میں سے، بہت کم حصہ ادا کرنا فرض کیا گیا ہے، مثلاً: انسان کی نقد ملکیت میں ہر سو روپے پر صرف اڑھائی روپے نکالنا ضروری قرار دیا گیا ہے، جو دیکھا جائے تو بہت کم بنتا ہے، اور صاحبِ مال کیلئے زیادہ نقصان کا موجب نہیں بنتا، اس پر مستزاد یہ کہ اس کا مال پاکیزہ ہوجاتا ہے اور اللہ رب العزت کی محبت اور رضا کے علاوہ، مال کی برکت کے وعدے حاصل ہوتے ہیں:

[وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ][1]

[وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝][2]

زکوٰۃ ادا نہ کرنیوالوں کیلئے سخت وعید

اس قدر آسانی کے باوجود، جو لوگ ادائیگی زکوٰۃ میں پس وپیش سے کام لیتے ہیں، یا کسی قسم کی غفلت اور کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ اللہ رب العزت کی طرف سے شدید ترین وعید کے مستحق ٹھہرتے ہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم فرمایا ہے: (باب إثم مانع الزکاۃ) یعنی: زکوٰۃ نہ دینے والے کے گناہ (اور وعید) کا ذکر۔

اس باب کے تحت سورۃ التوبہ کی درج ذیل دو آیات کا ذکر فرمایا ہے:

[وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝][3]

ترجمہ: اور جو لوگ سونے چاندی کا خزانہ رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں

[1] الروم: ۶
[2] النساء: ۸۷
[3] التوبة: ۳۵،۳۴

دردناک عذاب کی خبر پہنچا دیجئے۔ جس دن اس خزانے کو آتش دوزخ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (ان سے کہا جائے گا) یہ ہے جسے تم نے اپنے لئے خزانہ بنا کر رکھا تھا، پس اپنے خزانوں کا مزہ چکھو۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بعض احادیث بیان فرمائی ہیں، جن میں زکوۃ ادا نہ کرنے والے کیلئے مختلف الانواع سزاؤں کا ذکر ہے، چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا:

ترجمہ: آدمی نے اگر اپنے اونٹوں میں سے حق زکوٰۃ ادا نہ کیا تو وہ اونٹ قیامت کے دن بہت ہی مضبوط حالت میں آئیں گے اور اس شخص کو اپنے قدموں تلے روندیں گے، بکریاں اپنے سینگوں سے ٹکریں ماریں گی اور اسے اپنے قدموں تلے روندیں گی۔

احادیث سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن جانوروں کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو، انہیں اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا اور بری طرح مدد کیلئے پکارے گا، رسول اللہ ﷺ اس کی ان دہائیوں کو سن کر فرمائیں گے: (لا أملك لك شيئا قد بلغت) یعنی: میں تمہارے لئے کسی چیز کا مالک یا مختار نہیں ہوں، میں نے پورا دین پہنچا دیا تھا۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مال سے زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہوگی، اسے قیامت کے دن ایک ہیبت ناک سانپ کی شکل دیدی جائے گی، جو اس کے گلے کا طوق بن جائے گا اور اس کے جبڑوں کو اپنی گرفت میں لیکر کہے گا: (انا مالک، انا کنزک) یعنی: میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔

ادائیگیٔ زکاۃ کے تعلق سے ایک نکتہ

امام بربہاری رحمہ اللہ اپنی کتاب "شرح السنۃ" جس کا اصل موضوع بیانِ عقیدہ ہے، میں زکوٰۃ کے تعلق سے ایک نکتہ ذکر فرماتے ہیں:

(فإن قسمها فجائز وإن دفعها إلى الإمام فجائز)

یعنی: اگر زکوٰۃ دینے والا اپنا مالِ زکوٰۃ خود مستحقین میں تقسیم کردے تو یہ بھی جائز ہے اور اگر امام وقت کو ادا کردے تو یہ بھی جائز ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے شیخ صالح الفوزان حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر امام وقت زکوٰۃ طلب کرے تاکہ وہ خود اسے تقسیم کرے، تو اسے ادا کرنا ضروری ہوگا، دریں صورت وہ خود ذمہ دار اور مسئول ہوگا؛ کیونکہ امام کی اطاعت واجب ہے، اور جب صاحب مال، اپنا مال امام وقت کو سونپ دے گا تو وہ بری الذمہ ہوجائے گا؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنی حیاتِ مبارکہ میں اصحابِ اموال کے پاس اپنے نمائندے برائے وصولیٔ زکوٰۃ بھیجا کرتے تھے اور آپ ﷺ خود اس مال کو مستحقین میں تقسیم فرمایا کرتے تھے، آپ ﷺ کے بعد آنے والے ولاۃ الامور، اس سلسلے میں آپ ﷺ کے قائم مقام متصور ہونگے، ہاں اگر امام مالِ زکوٰۃ طلب نہ کرے تو صاحبِ مال اپنی مرضی سے اور اپنی ذمہ داری کے ساتھ مستحقین میں تقسیم کرسکتا ہے۔

چوتھا رکن اسلام: صیام رمضان

حدیث جبریل میں اسلام کی تعریف میں مذکور چوتھی چیز، رمضان کے روزے ہیں، روزہ اسلام کا چوتھا رکن ہے، یہ ایک بدنی عبادت ہے، جس کی شرعی تعریف یہ ہے: الإمساك عن المفطرات من طلوع الفجر الثاني إلى غروب الشمس تعبداً لله۔
یعنی: اللہ تعالیٰ کی عبادت انجام دیتے ہوئے فجر ثانی کے طلوع سے لیکر غروب آفتاب تک تمام مفطرات سے رُکے رہنا۔

مفطرات اور ان کی شرطیں

مفطرات سے مراد وہ امور ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، مثلاً: کھانا، پینا اور جماع وغیرہ۔
مفطرات کے تعلق سے ایک وضاحت پیشِ خدمت ہے، جو عام طور پہ کتب میں ذکر نہیں ہوتی:
کوئی بھی مفطر چیز اس وقت تک روزہ توڑنے کا سبب نہیں بنے گی جب تک اس میں تین شرطیں نہ پائی جائیں: ① اسے اس مفطر شیٔ کا علم ہو ② مفطر شیٔ کا استعمال بھول کر نہ کیا ہو ③ مفطر شیٔ کا استعمال ارادہ کے ساتھ ہو۔

پہلی شرط کی توضیح اس طرح ہے کہ اگر ایک شخص یہ سمجھ کر کہ سورج غروب ہو چکا ہے کچھ کھا پی لیتا ہے، بعد میں اسے علم ہوتا ہے کہ ابھی تک سورج غروب نہیں ہوا، تو اس کا روزہ درست ہوگا؛ کیونکہ اس کا کھا پی لینا عدم علم کی بناء پر تھا، اس کی دلیل صحیح بخاری میں مروی اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے، وہ فرماتی ہیں: ہم نے ایک روز نبی علیہ السلام کے دور میں جبکہ مطلع ابر آلود تھا، روزہ افطار کرلیا، بعد میں سورج دوبارہ نظر آگیا۔

رسول اللہ ﷺ نے قضاء کا حکم نہیں دیا تھا، اگر قضاء واجب ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ضرور حکم دیتے اور وہ حکم ہماری طرف منقول ہوتا۔
دوسری شرط یہ ہے کہ مفطر شیٔ کا استعمال جان بوجھ کر ہو تو روزہ ٹوٹے گا، اگر بھولے سے ہوگیا تو نہیں ٹوٹے گا۔
مذکورہ دونوں شرائط کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی بن سکتی ہے:
[رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ][1]
یعنی: اے ہمارے رب! ہماری بھول چوک اور خطاء پر ہمارا مواخذہ نہ فرمانا۔
نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
[وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ][2]
یعنی: تمہاری خطاء پر کوئی حرج نہیں، لیکن جو تمہارے دل کے قصد کے ساتھ ہو۔ (یعنی جان بوجھ کر)
تیسری شرط سے مراد یہ ہے کہ مفطر شیٔ کا استعمال اپنے ارادہ سے ہو تو روزہ ٹوٹے گا، مثلاً: بعض اوقات کسی شخص کو جبر وا کراہ کے ساتھ کھانے پینے پر مجبور کر دیا جائے، یا بحالتِ نیند کوئی کھانے پینے کی چیز اس کے منہ میں داخل ہو جائے، تو یہ صورتیں روزے کیلئے ناقض نہیں ہونگی۔ فقہاء نے اسی سے ایک اور مسئلہ استنباط کیا ہے، اور وہ یہ کہ شوہر کا روزے دار بیوی کو جماع پر مجبور کرنا، دریں صورت عورت پر قضاء نہیں ہوگی، نہ کسی قسم کا کفارہ۔ (انتہیٰ ملخصاً من کلام الشیخ ابن عثیمین)

روزے کی فضیلت میں سب سے جامع حدیث

عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: كل عمل ابن آدم له الحسنة

---

[1] البقرة: ٢٨٦
[2] الاحزاب: ٥

بعشر أمثالها الی سبع مائة ضعف.قال الله عزوجل الا الصیام فانه لی وأنا أجزی به.انه ترک شهوته وطعامه وشرابه من أجلی.للصائم فرحتان:فرحة عند فطره وفرحة عند لقاء ربه.ولخلوف فم الصائم أطیب عند الله من ریح المسک.

ترجمہ:ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:ابن آدم کا ہر عمل اس کیلئے (اس طرح باعث اجر ہے) کہ ایک نیکی دس گنا سے لیکر سات سو گنا کے برابر ہو جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:سوائے روزہ کے،بے شک وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دونگا،کیونکہ بندہ اپنی (جائز) خواہشات نفس اور کھانا پینا میرے لئے چھوڑتا ہے۔روزہ دار کیلئے دو خوشیاں ہیں: ایک افطار کے وقت دوسری اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت۔روزہ دار کے منہ کی بُو اللہ تعالیٰ کو کستوری کی خوشبو سے زیادہ محبوب ہے۔

روزہ ایک سری عبادت ہے

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جسے سرّیت کا تمیز حاصل ہے، یعنی یہ بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان ایک راز ہے،جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات رمضان کے مہینے میں ایک شخص کا روزہ نہیں ہوتا اور لوگ اسے روزہ دار سمجھتے ہیں،جبکہ عام دنوں میں ایک شخص کا نفلی روزہ ہوتا ہے اور لوگ اسے روزہ سے نہیں سمجھ رہے ہوتے۔

اسی سریت اور راز داری نے روزہ کے اجر کو کئی چند بڑھا دیا،چنانچہ ہر نیکی کا صلہ دس گنا سے سات سو گنا تک ہے (اور یہ بھی بہت زیادہ ہے) جبکہ روزے کا اجر بلا حساب ہے،اللہ تعالیٰ حدیث قدسی میں فرماتا ہے:(فإنه لی وأنا اجزی به) یعنی:یہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزاء دونگا۔

امر واقع یہ ہے کہ ہر نیکی اللہ کیلئے ہے،جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان:

[قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦٢﴾][1]

یعنی:کہہ دیجئے!میری تمام بدنی اور مالی عبادات،نیز میری پوری زندگی اور موت،اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔

اس حدیث میں روزہ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ یہ میرے لئے ہے (حالانکہ ہر عمل اللہ تعالیٰ کیلئے ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ روزہ سراسر ایک مخفی عمل ہے،جس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مطلع نہیں ہو پاتا۔

اس بیان سے یہ فقہ حاصل ہوتی ہے کہ روزے دار انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے روزے کو مخفی رکھنے پر بھرپور توجہ دے،ایسی کوئی حرکت نہ کرے جس سے وہ اپنا روزہ دار ہونا ظاہر کر رہا ہو۔

ویسے بھی رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:(من صام یرائی فقد أشرک) دکھاوے کا روزہ شرک ہے۔

واضح ہو کہ مذکورہ حدیث ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کا پہلا جملہ صحیح بخاری میں ایک دوسری سند کے ساتھ اس طرح وارد ہے:

(لکل عمل کفارة والصوم لی وأنا اجزی به ...الحدیث)[2]

یعنی (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) ہر عمل کیلئے کفارہ ہوتا ہے جبکہ روزہ میرے لئے ہے اور میں نے اس کی جزاء ضرور دینی ہے۔

اس حدیث میں روزہ کی ایک نہایت منفرد اور عظیم الشان فضیلت مذکور ہے،جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ ہر عمل یا عبادت بندے کیلئے کفارہ کے طور پر ہے،کفارہ ہونے کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ بندہ جو گناہ کرتا ہے وہ روزہ کے علاوہ بقیہ اعمالِ صالحہ کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں

[1] الانعام:۱۶۲

[2] صحیح بخاری رقم الحدیث ۷۵۳۸

اور یہی ان اعمال کی جزاء ہے،اب حصولِ ثواب اور دخولِ جنت کیلئے کوئی عظیم عمل چاہئے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:وہ عمل روزہ ہے جو میرے لئے ہے اور میں نے اس کی یہ جزاء ضرور دینی ہے۔

روزے کا ثواب ہر حال میں

دوسرا معنی یہ ہے کہ قیامت کے دن حقوق العباد کے سلسلہ میں بندے کی نیکیاں اصحابِ حقوق میں ایک ایک کرکے تقسیم ہونگی، جب روزہ باقی رہ جائیگا جو اللہ تعالیٰ کیلئے ہے اور جس کی جزاء اللہ تعالیٰ نے ضرور دینی ہے،تو اللہ تعالیٰ روزہ کو تقسیم ہونے سے بچالے گا اور بندہ کے بقیہ حقوق اپنے ذمہ لے لیگا اور اسے روزہ کی برکت سے جزاء عطا فرماکے جنت میں داخل کردے گا۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هذا من أجود الأحاديث وأحكمها ،اذا كان يوم القيامة يحاسب الله عبده،ويؤدى ماعليه من المظالم من سائر عمله ،حتى لايبقى إلا الصوم، فيتحمل الله عزوجل مابقي عليه من المظالم ،ويدخله بالصوم الجنة.[1]

یعنی: روزہ کے فضائل میں یہ حدیث سب سے عمدہ اور ٹھوس ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کا حساب لے گا اور اس کے مظالم کے سلسلہ میں حقداروں میں اسکی تمام نیکیاں تقسیم فرمادے گا، آخر میں روزہ باقی رہ جائیگا، تو اللہ تعالیٰ اسکے بقیہ مظالم اپنے ذمہ لے لیگا اور روزہ کی برکت سے اس شخص کو جنت میں داخل کردے گا۔

حافظ ابن رجب الحنبلی البغدادی رحمہ اللہ اس پر یوں تعلیق قائم کرتے ہیں:

(ترجمہ) روزہ چونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے لازماً اسکی جزاء دینے کا وعدہ فرمایا ہے، لہذا اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک محفوظ ذخیرہ کی شکل میں موجود ہے، بندے کے بقیہ اعمال کفارہ ذنوب یا قصاصِ حقوق میں خرچ ہوجائیں گے اور اس کے روزے دخولِ جنت کا

[1] شعب الایمان للبیہقی:۳/۲۹۵

باعث بن جائیں گے۔

اسی قسم کا قول مشہور تابعی سعید بن جبیر سے بھی منقول ہے

(۲) روزہ کے اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسی عبادت ہے جو بندے اور اسکے پروردگار کے درمیان ایک خفیہ اور سرّی معاملہ ہے، جس پر دوسرا کوئی شخص مطلع نہیں ہوسکتا؛ کیونکہ روزہ نیت باطنہ کا نام ہے، نیز روزہ دار کے ترک طعام وشراب کا معاملہ اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، وہ تنہا بیٹھا ہونے اور بھوکا وپیاسا ہونے کے باوجود کھانے یا پانی کے قریب تک نہیں پھٹکتا، تیسری بات یہ ہے کہ ہر عبادت مثلاً: نماز، زکوٰۃ، حج، عمرہ، قربانی اور جہاد وغیرہ ظاہری عمل پر مشتمل ہے جو دوسروں کو دکھائی دیتی ہے، لیکن روزہ ایک ایسی خفیہ اور سرّی عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں دیکھ پاتا، لہذا یہ عبادت ریاءکاری سے بالکل پاک ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے روزہ کو اپنی ذات کیلئے خاص فرمالیا۔

سرّی عبادت جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضاء کیلئے کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدرومنزلت کی مستحق ہوتی ہے اس کا اندازہ درج ذیل فرمانِ باری تعالیٰ سے بھی بخوبی ہوتا ہے:

[تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝۱۶ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۷][1]

یعنی: جدا ہوتے ہیں ان کے پہلو بستروں سے، پکارتے ہیں اپنے رب کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمت کا طمع کرتے ہوئے اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، پس کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کیلئے، ان کیلئے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے، یہ جزاء ہے جو وہ عمل کیا کرتے تھے۔

[1] السجدۃ:۱۶،۱۷

ان آیات مبارکہ میں بندوں کے ایک مخفی اور سری عمل کا ذکر ہے، اور وہ ہے ان کا رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنے بستروں کو چھوڑ دینا اور اپنے پروردگار سے خوف وطمع کے ساتھ راز ونیاز کرتے رہنا۔

چونکہ ان کا یہ عمل سو فیصد پوشیدہ ہے، لہذا اللہ تعالی نے اس عمل کی جزاء بھی پوشیدہ فرمادی، چنانچہ اللہ تعالی کے فرمان کے مطابق کسی نفس کو ان کی جزاء کا علم نہیں، اللہ تعالی روز قیامت کس طرح ان کی آنکھیں ٹھنڈی فرمائے گا، کوئی نہیں جانتا۔

روزے کا پوشیدہ اور مخفی ہونا ایک ایسا تمیز ہے، جو کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں، لہذا ہم روزے کے تعلق سے یہ اہم نصیحت کرنا چاہیں گے کہ اس تمیز کو کماحقہ برقرار رکھا جائے، اور اللہ تعالی کی رضا جوئی کی خاطر اسے پوشیدہ رکھنے کی مقدور بھر سعی کی جائے۔

روزے کی "سریت" کیسے حاصل کریں

یہاں ایک اہم نکتہ کی نشاندہی فائدہ سے خالی نہ ہوگی، وہ نکتہ بھی سریت سے متعلق ہے، جس کی تفصیل یوں ہے کہ رمضان المبارک میں تو سب ہی روزہ رکھتے ہیں لہذا اس کا سری اور مخفی ہونا ممکن نہیں رہتا، البتہ رمضان کے علاوہ اگر روزے کا اہتمام کیا جائے تو پوری طرح اس عمل کی سریت برقرار رکھی جا سکتی ہے، چنانچہ کچھ نفلی روزے جو نبی ﷺ رکھا کرتے تھے کا اہتمام کرلیا جائے، مثلاً: ایام بیض کے تین روزے، جنہیں شریعت نے رمضان کے روزوں کے ساتھ زمانہ بھر کے روزے قرار دیا ہے، اس کے علاوہ ہر پیر اور جمعرات کا روزہ بھی مسنون ہے، جن کی اہمیت یہ ہے کہ ان دودنوں میں بندوں کے اعمال اللہ تعالی کے روبرو پیش کئے جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

(ھذان الیومان یرفع فیھما العمل إلی اللہ،فأحب ان یرفع عملی وأنا صائم)

یعنی: یہ دودن وہ ہیں جن میں بندوں کے اعمال، اللہ تعالی کی طرف اٹھائے جاتے

ہیں، پس میری یہ چاہت ہے کہ جب میرے اعمال پیش ہوں تو میں روزے سے ہوں۔

اس حدیث سے روزے کی اہمیت مزید آشکارہ ہوتی ہے، نیز نفلی روزے کے اہتمام کی عظمت بھی سامنے آتی ہے، نیز پیر اور جمعرات، دودنوں کو خصوصی اہتمام دینے کی ترغیب بھی ملتی ہے؛ کیونکہ ان دودنوں میں بندوں کے اعمال اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ روزے کے تعلق سے کچھ امور مخالفت سنت، بلکہ غلو کے زمرے میں آتے ہیں، جن میں سے دو کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر

① افطاری میں تعجیل یعنی جلدی کرنا اور سحری میں تاخیر یعنی دیر کرنا افضل بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی مبارک سنت بھی، بلکہ ان دونوں امور کو لوگوں کی بھلائی اور بہتری کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے:

(بکروا بالإفطار وأخروا السحور)

یعنی: افطار میں جلدی کرو اور سحری میں تاخیر کرو۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر وفی لفظ أخروا السحور)

یعنی: لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں اور سحری لیٹ کرتے رہیں۔

لہذا افطار میں تاخیر کرکے روزے کی طوالت بڑھانا نہ تو نیکی ہے نہ موجب تقوی، بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف بھی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس روش کو یہود ونصاری کی مشابہت قرار دیا ہے اور دین اسلام جو مبنی برغیرت دین ہے سے ہمیں یہ ہدایت ملتی ہے کہ ہم یہود

ونصاریٰ کی ڈٹ کر مخالفت کریں۔ (خالفوا الیھود والنصریٰ)

"وصال" کا حکم

② دوسرا امر وصال فی الصیام کے تعلق سے ہے، یعنی سحری سے سحری تک یا افطاری سے افطاری تک روزہ رکھنا، یہ بھی رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے خلاف ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (لا وصال فی الصیام) یعنی: روزے میں وصال نہیں۔

نیز فرمایا: (إیاکم والوصال) یعنی: تم وصال سے بچو۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے وصال کی ممانعت کی علت بھی نصاریٰ کی مخالفت ذکر کی ہے، ملاحظہ ہو: (اقتضاء الصراط المستقیم بمخالفة أصحاب الجحیم)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شریعتِ مطہرہ کس قدر یہود ونصاریٰ کے تشبہ سے روکتی اور باز رکھتی ہے، حالانکہ وصال فی الصیام روزے کی طوالت کا سبب بنتا ہے، جو زیادہ باعثِ اجر ہونا چاہئے، مگر یہود ونصاریٰ سے تشبہ کسی صورت جائز نہیں، یہی دین اسلام کی غیرت کا تقاضا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت نے طلوع وغروبِ آفتاب کے موقع پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے؛ کیونکہ عباد الشمس، ان دو اوقات میں عبادت کرتے ہیں، لہذا شریعت نے اس عبادت ہی کو باطل قرار دے دیا، جو مشرکین سے تشبہ کا سبب بنے۔

بہر حال روزہ، بلکہ ہر عبادت میں اصل نکتہ، رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے، جبکہ ابتداع کا راستہ سراسر باطل اور گمراہی ہے۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: (اتبعوا ولا تبتدعوا فقد کفیتم)

یعنی: اتباع کرو، ابتداع نہ کرو، کتاب وسنت میں ہی کفایت ہے۔

روزے کے بارہ میں مزید تفصیل کیلئے ہمارے رسالہ "روزہ، احکام اور ثمرات" کا مطالعہ کیا جائے۔ (واللہ ولی التوفیق)

اسلام کا پانچواں رکن: حج

اسلام کا پانچواں رکن حج بیت اللہ ہے، حج کی فرضیت 9ھ میں نازل ہوئی، رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی حج فرمایا، جسے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، آپ ﷺ نے دس ہجری میں حج کیا تھا، جبکہ آپ ﷺ سے چار عمرے کرنا ثابت ہیں۔

حج وعمرہ سے مقصود، ان مقامات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کا ذکر بلند کرنا ہے، جن مقامات میں اللہ تعالیٰ نے عبادت کا حکم ارشاد فرمایا ہے، سنن ابی داود اور جامع ترمذی میں ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(إنما جعل رمی الجمار والسعی بین الصفا والمروۃ لإقامة ذکر اللہ)

یعنی: شیطانوں کو کنکریاں مارنے اور صفا ومروہ کے مابین سعی کرنے کی مشروعیت، اللہ تعالیٰ کا ذکر بلند کرنے کیلئے ہے۔

فرضیت حج کے دلائل

حدیث جبریل سے ثابت ہوگیا کہ حج اسلام کا رکن ہے، جو فرضیتِ حج کی دلیل ہے، حج کی فرضیت قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝] [1]

---

[1] آل عمران: ۹۶

یعنی: اللہ تعالیٰ کیلئے بیت اللہ کا حج کرنا، لوگوں پر فرض ہے، وہ لوگ جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں اور جو کفر کرے گا (اس پر واضح ہو) اللہ تعالیٰ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

آیت مِبارکہ میں کلمہ (علی) فرضیت کی دلیل ہے، نیز آیت مبارکہ بصراحت بتلا رہی ہے کہ اس کی فرضیت کو نہ ماننا کفر ہے، نیز قولہ تعالیٰ: [فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴿۹۷﴾] سے یہ بات مفہوم ہو رہی ہے کہ حج کے تمام تر فائدے لوگوں کیلئے ہیں، اسی لئے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: [لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ...... الآية] [1]

یعنی: تاکہ حجاج کرام فریضہ حج ادا کرتے ہوئے اپنے منافع (دنیا و آخرت کے) سمیٹ لیں اور ایام معلومات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہیں۔

فرضیت ِحج کیلئے صحیح مسلم کی درج ذیل حدیث کا معلوم ہونا ضروری ہے، یہ حدیث ایک انتہائی اہم علم بھی دیتی ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: (أیھا الناس قد فرض علیکم الحج فحجوا) فقال رجل أکل عام؟ فقال: (لو قلت نعم لوجبت، ولما استطعتم)

ترجمہ: ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے، لہذا ضرور حج کرو۔ ایک شخص نے کہا: کیا ہر سال؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جائے گا، اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھو گے۔

یہ حدیث جہاں فرضیت ِحج کی دلیل ہے، وہاں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ حج زندگی میں ایک بار فرض ہے، ہر سال نہیں۔

اس حدیث سے ایک انتہائی نفیس نکتہ یہ حاصل ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر فرمان کس

[1] الحج: ۲۸

قدر اہم اور مؤکد ہے، چنانچہ اس سائل کے جواب میں اگر آپ ﷺ صرف لفظ (نعم) یعنی: ہاں کہہ دیتے تو تمام مسلمانوں پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا۔

ادائیگیِ حج میں جلدی کرنی چاہیئے

اگر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا تو کس قدر دشوار ہوتا، شریعت مطہرہ نے زندگی بھر کیلئے صرف ایک بار حج کا حکم دیکر ہمارے لئے کتنی آسانی پیدا فرما دی، چنانچہ اس آسانی پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیئے، جس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ادائیگیِ حج میں تاخیر نہ کی جائے بلکہ ایک انسان کو جونہی استطاعت میسر آجائے فوراً حج کرلے، بلاعذر حج کو مؤخر کرتے رہنے پر وہ یقیناً گناہگار ہوگا۔

مسند احمد میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (تعجلوا إلی الحج فإن أحدکم لا یدری ما یعرض له) یعنی: فریضہ حج کی ادائیگی میں جلدی کرو؛ کیونکہ تمہیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ آگے تم پر کیا بیتنے والی ہے۔

ایک بار سے زائد حج، نفلی شمار ہوگا، مسند احمد اور کتب ِسنن وغیرہ میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے: (الحج مرة فمن زاد فھو تطوع) یعنی: حج ایک بار فرض ہے، جس نے ایک بار سے زائد حج کیے وہ نفل ہونگے۔

میت کی طرف سے حجِ بدل کے متعلق ایک انتہائی اہم مسئلہ

واضح ہو کہ ایک شخص طاقت ہونے کے باوجود فریضہ حج کو مؤخر کرتا رہا اور حج کئے بغیر ہی مرگیا تو اس کے وارث اس کی طرف سے حج ادا نہیں کریں گے؛ کیونکہ وہ اپنی زندگی میں حج کرنا چاہتا ہی نہیں تھا، تو اس کے مرنے کے بعد اس کی طرف سے کیونکر حج کیا جائے گا۔

شیخ صالح بن عثیمین رحمہ اللہ ایک سوال کا جواب دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ جس شخص نے حج نہ کیا ہو کیا اس کے ورثاء اس کے ترکہ میں سے حج کی رقم نکال سکتے ہیں؛ تاکہ اس کی طرف سے حج کروالیا جائے؟

جواب: نہیں؛ کیونکہ یہ حج اسے کوئی فائدہ نہ دیگا، لہذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف اختیار کیا جائے، جو شخص قدرت واستطاعت کے باوجود حج نہ کرسکا حتی کہ مرگیا، اس کی طرف سے اگر ہزار بار بھی حج کرلیا جائے تو وہ بری الذمہ نہ ہوسکے گا۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اسی مسئلہ کو پسند کیا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا دین قرار دیا ہے۔

حج کی استطاعت دو طرح سے ہے، ایک بدنی دوسری مالی، بدنی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ وہ طویل سفر کرنے، سواری پر بیٹھنے اور مناسک حج ادا کرنے کے قابل ہو، جبکہ مالی استطاعت سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو مصارف حج وسفر کیلئے کفایت کرجائے نیز جن اہل وعیال کو چھوڑ کر حج کرنے جارہا ہے ان کے نان ونفقہ کا بھی پورا بندوبست ہو۔

حج بدل کے احکامات

میت کی طرف سے حج کیا جاسکتا ہے، جہاں تک زندہ شخص کا تعلق ہے تو اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہیں، البتہ دو حالتوں میں کیا جاسکتا ہے، ایک یہ کہ وہ زندہ شخص انتہائی بوڑھا اور کمزور ہو کہ وہ سواری اور سفر کے قابل ہی نہ ہو، اور دوسری یہ کہ وہ کسی ایسے شدید مرض میں مبتلا ہوچکا ہو جس سے شفایابی کی کوئی امید نہ رہی ہو۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ بنو خثعم قبیلہ کی ایک عورت، رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہے: میرے والد مالی طور پر حج کی استطاعت حاصل کرچکے ہیں، مگر وہ اس قدر بوڑھے ہوچکے ہیں کہ سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں رہے، کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (حجی عنه) تم اپنے والد کی طرف سے حج کرلو۔[1]

البتہ کسی کی طرف سے حج کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنا حج کرچکا ہو، چنانچہ سنن ابی

[1] بخاری ومسلم

داؤد اور ابن ماجہ وغیرہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو (لبيك عن شبرمة) کہتے ہوئے سنا، (گویا وہ شبرمہ کی طرف سے حج کررہا تھا) تو آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم اپنا حج کرچکے ہو؟ اس نے کہا: نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (حج عن نفسك ثم حج عن شبرمة) پہلے اپنا حج کرلو پھر شبرمہ کی طرف سے کرلینا۔

آج کل کچھ لوگ دیکھے جاتے ہیں جو محض مال کے حصول کیلئے اپنے آپ کو حج بدل کیلئے پیش کرتے رہتے ہیں، جس شخص کی یہی نیت کارفرما ہو اس کا حج صحیح نہیں، ضروری ہے کہ حج بدل کرنے والے بڑے اخلاص کے ساتھ اور امانت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے اس بھائی کو پورا پورا نفع پہنچانے کی کوشش کریں جس کی طرف سے حج کررہے ہیں۔ واللہ المستعان

عورتوں پر حج کی فرضیت

واضح ہو کہ مَردوں کی طرح عورتوں پر بھی حج کرنا فرض ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے حج وعمرہ کو ایک خاتون کا جہاد قرار دیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت حج یا عمرہ کی ادائیگی پر بہت زیادہ اجر وثواب کی مستحق ہے۔ البتہ استطاعت کے تعلق سے عورت پر ایک اضافی شرط عائد ہوتی ہے اور وہ اس کے محرم کا ہونا ہے۔ البتہ مکہ میں مقیم عورت کیلئے محرم کی شرط نہیں ہے۔

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: میری بیوی حج کیلئے جارہی ہے، جبکہ میرا نام فلاں غزوہ میں شامل کردیا گیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (انطلق فحج مع إمرأتك) تم غزوہ میں جانے کی بجائے اپنی بیوی کے ساتھ حج کرنے چلے جاؤ۔[1]

صحیح بخاری ومسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے: (لا يحل لإمرأة تسافر مسيرة يوم وليلة ليس معها محرم) یعنی: عورت کیلئے ایک دن اور رات کی مسافت کا سفر، محرم کے بغیر جائز نہیں ہے۔

[1] بخاری ومسلم

امام احمد بن حنبل ﷫ فرمایا کرتے تھے کہ عورت کیلئے محرم [مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا] کے تحت فرض ہے، جس عورت کا محرم نہ ہو اس سے فرضیت حج ساقط ہو جاتی ہے۔

عورت کا محرم اس کا شوہر ہے یا ہر وہ شخص جس سے دائمی طور پر نکاح کرنا حرام ہو، مثلاً: بھائی، باپ، چچا وغیرہ

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لایحل لامرأة تؤمن باالله أن تسافر إلا ومعها أبوها أو إبنها أو زوجها أو أخوها أو ذو محرم منها)[1]

یعنی: جو عورت اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے اس کیلئے حلال نہیں کہ وہ اپنے باپ یا بیٹے یا شوہر یا بھائی یا کسی محرم کے بغیر سفر کو نکلے۔

حج وعمرہ کی اہمیت وفضیلت کے متعلق احادیث

حج وعمرہ کی اہمیت، فضیلت وضرورت کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ مروی چند ارشادات گرامی پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔(عن ا بی هريرة قال قال النبی ﷺ العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما والحج المبرور ليس له جزاء من الجنة)[2]

ترجمہ: ابوھریرہ ﷛ سے مروی ہے کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عمرہ گذشتہ عمرہ کے درمیان سرزد ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور کا بدلہ تو جنت ہے۔

۲۔عن عمر قال قال النبی ﷺ: (الإسلام: أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله وأن تقيم الصلاة وتوتی الزكاة وتحج وتعتمر وتغتسل من الجنابة وأن تتم الوضوء وتصوم رمضان)[3]

---

[1] صحیح مسلم

[2] متفق علیه

[3] رواہ ابن خزیمہ

ترجمہ: عمر ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں ہے اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ نماز قائم کرے اور زکاۃ ادا کرے اور حج وعمرہ کرے اور جنابت سے غسل کرے اور وضو مکمل کرے اور رمضان کے روزے رکھے۔

۳۔(عن ابن مسعود قال قال النبی ﷺ تابعوا بين الحج والعمرة وإنهما ينفيان الفقر والذنوب كما ينف الكير خبث الحديد والذهب والفضة وليس للحج المبرور ثواب إلا الجنة)[1]

ترجمہ: پے در پے حج اور عمرہ کرو پس یہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح مٹا دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے زنگ کو دور کر دیتی ہے اور حج مبرور کا ثواب تو جنت ہے۔

حاجی اور عمرہ کرنے والا اللہ کا مہمان ہے

۴۔(عن جابر قال قال النبی ﷺ الحاج والعمار وفد الله دعاهم فأجابوه وسألوه فأعطاهم)[2]

ترجمہ: جابر ﷛ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: حج اور عمرہ کرنے والے اللہ کے مہمان ہیں اللہ نے ان کو بلایا تو انہوں نے لبیک کہا اور انہوں نے اللہ سے مانگا تو اللہ نے ان کو عطا کیا۔

اس حدیث سے یہ فقہ حاصل ہو رہی ہے کہ جب حاجی نے اللہ تعالیٰ کے بلانے پر لبیک کہہ دیا اور اس کے گھر حاضر ہو گیا تو اب وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا مہمان بن چکا ہے اور مہمان کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ہر تمنا اور دعا قبول فرمائے گا۔

۵۔(عن ابی هريرة قال قال النبی ﷺ وفد الله ثلاثة: الحاج والمعتمر والغازی)[3]

---

[1] رواہ الترمذی

[2] رواہ البزار

[3] [illegible]

ترجمہ: اللہ کے مہمان تین ہیں: حاجی، عمرہ کرنے والا اور غازی۔

بیت اللہ سے خوب فائدہ اٹھاؤ

۶۔(عن ابن عمر قال قال النبی ﷺ استمتعوا بهذا البيت فقد هدم مرتين ويرفع في الثالثة) [1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے اس گھر سے خوب فائدہ اٹھاؤ: کیونکہ یہ دو دفعہ گرایا جا چکا ہے اور تیسری بار اٹھا لیا جائے گا۔(لہٰذا اس وقت کے آنے سے پہلے پہلے اس گھر سے خوب خوب فائدہ اٹھالو)

حاجی اور عمرہ کرنے والا جب (حالت احرام میں) وفات پا جائے

۷۔(عن ابی هريرة قال قال النبی ﷺ من خرج حاجا فمات كتب له أجر الحاج إلى يوم القيامة ومن خرج معتمرا فمات كتب له أجر المعتمر إلى يوم القيامة ومن خرج غازيا فمات كتب له أجر الغازي إلى يوم القيامة) [2]

ترجمہ: جو شخص حج کیلئے نکلے اور اسے راستے ہی میں موت آجائے تو اس کیلئے قیامت تک کیلئے حاجی کا ثواب لکھا جاتا ہے اور جو عمرہ کیلئے نکلے اور اسے راستے میں موت آجائے تو اس کیلئے قیامت تک کیلئے عمرہ کرنے والے کا ثواب لکھا جاتا ہے، اور جو شخص جہاد کیلئے نکلے اور اسے راستے میں ہی موت آجائے تو اس کیلئے قیامت تک کیلئے غازی کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

عمرہ کا ثواب تھکاوٹ اور خرچ کے بقدر ہے

۸۔(عن عائشة أن رسول الله ﷺ قال لها في عمرتها لكنها على قدر نصبك اونفقتك) [3]

ترجمہ: عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان کے عمرہ کے متعلق فرمایا: تمہارا عمرہ (کا ثواب) تمہاری تھکاوٹ اور خرچ کے بقدر ہے۔

[1] رواہ ابن خزیمہ
[2] رواہ ابو یعلیٰ
[3] متفق علیہ

رمضان میں عمرہ کی فضیلت

۹۔(عن ابن عباس قال لما رجع النبی ﷺ من حجته قال لأم سنان الأنصارية: ما منعك من الحج معنا؛ قالت كان لنا نازح فركبه أبو فلان تعني زوجها حج على أحدهما وترك الآخر يسقي أرضا لنا قال: فإذا كان رمضان فاعتمري فإن عمرة في رمضان تقضي حجة معي) [1]

ترجمہ: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ حجۃ الوداع سے لوٹے تو ام سنان الانصاریہ سے پوچھا: تمہیں ہمارے ساتھ حج کرنے سے کس چیز نے روکا؟ اس نے کہا ہمارے پاس صرف دو اونٹنیاں ہیں ایک پر تو میرے شوہر نے حج کیا ہے اور دوسری ہماری زمین کو سیراب کرتی رہی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: تم رمضان میں عمرہ کر لینا کیونکہ رمضان کا عمرہ میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔

ستر نبیوں نے بیت اللہ کی طرف سفر کیا ہے

۱۰۔(عن ابی موسیٰ قال قال النبی ﷺ لقد مر بالروحاء (موضع بين مكة والمدينة) سبعون نبيا فيهم نبي الله موسىٰ حفاة عليهم العباء يؤمون بيت الله العتيق) [2]

ترجمہ: ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: روحاء (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے) پر سے ستر نبی ننگے پاؤں گذرے ہیں ان میں موسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے۔ ان سب نے چغے پہنے ہوئے تھے اور وہ سب بیت اللہ کی طرف رواں دواں تھے۔

○○○○○○○○○○○

[1] متفق علیہ
[2] رواہ ابو یعلیٰ والطبرانی

جب رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی مکمل تعریف بیان فرمادی تو اس سائل نے کہا: (صدقت)

یعنی: آپ نے سچ فرمایا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: (فعجبنا له يسأله ويصدقه) یعنی: ہم نے تعجب کیا کہ یہ سائل خود ہی سوال کرتا ہے اور جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔

اس تعجب کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پہ سوال کرنے والا شخص، جہالت کی بناء پر سوال کرتا ہے، لہذا وہ جواب پالینے کے بعد اس پر مقتنع ہو کر قبول کر لیتا ہے، اس طرح تصدیق نہیں کرتا؛ کیونکہ تصدیق کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے پہلے سے جواب معلوم تھا، لہذا وہ تصدیق کر رہا ہے، تو گویا اس کا سوال کرنا اس کے جاہل ہونے کی دلیل تھا اور تصدیق کرنا اس کا عالم ہونا ظاہر کرتا ہے، تو ایک شخص عالم اور جاہل کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعجب کی وجہ ہے۔

جبریل کا دوسرا سوال: ایمان کیا ہے؟

اس کے بعد سائل (جبریل علیہ السلام) نے دوسرا سوال کر دیا، فرمایا:

(فاخبرني عن الايمان؟) یعنی: مجھے ایمان کے بارہ میں بتائیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: (أن تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر خيره وشره) یعنی: ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ، اور اس کے فرشتوں کے ساتھ، اور اس کی کتابوں کے ساتھ، اور اس کے رسولوں کے ساتھ، اور روز آخرت کے ساتھ، اور تم ایمان لاؤ تقدیر کے ساتھ خواہ اچھی ہو یا بری ہو۔

واضح ہو کہ یہ چھ چیزیں، ایمان کے ارکان ہیں، اس سے قبل اسلام کی تعریف میں پانچ امور کا ذکر ہوا تھا، وہ پانچوں امور اسلام کے ارکان قرار دیئے گئے ہیں، یوں اسلام اور ایمان کے مکمل طور پہ گیارہ ارکان ہوئے، جن کی کماحقہ معرفت ہر مسلمان مکلف کیلئے ضروری ہے، چنانچہ ایک بندہ کے مسلم اور مؤمن ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اسے ان گیارہ امور کا کماحقہ علم وادراک ہو، وہ گیارہ

امور درج ذیل ہیں:

اسلام اور ایمان کے گیارہ ارکان

① لا اله الا الله اور محمد رسول اللہ کی گواہی۔ ② نماز قائم کرنا ③ زکوۃ ادا کرنا ④ رمضان کے روزے رکھنا ⑤ استطاعت حاصل ہونے پر بیت اللہ کا حج کرنا ⑥ ایمان باللہ ⑦ ایمان بالملائکہ ⑧ ایمان بالکتب ⑨ ایمان بالرسل ⑩ ایمان بالیوم الآخر ⑪ ایمان بالقدر۔

اسلام کے پانچ ارکان کی وضاحت گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے، اب ہم ایمان کے چھ ارکان میں سے ہر رکن کی، اختصار کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے تشریح پیش کرتے ہیں۔

ایمان کا پہلا رکن (ایمان باللہ) یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔ یہ انتہائی اہم رکن ہے، بلکہ پورے ایمان کی اساس ہے؛ کیونکہ ایمان کے بقیہ ارکان مثلاً: ایمان بالملائکہ یا ایمان بالرسل وغیرہ اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک ایمان باللہ صحیح نہ ہو، لہذا ایمان باللہ اصل الأصول ہے اور تمام ایمانیات کی اساس ہے۔

ایمان باللہ کی تکمیل چار چیزوں سے

واضح ہو کہ ایمان باللہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک چار چیزوں پر درست طریقہ سے ایمان نہ ہو۔

① اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے موجود ہونے پر ایمان، جو شخص اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر ہے وہ مؤمن نہیں ہو سکتا، اور یہ بات معلوم ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر ہو ہی نہیں سکتا، اگرچہ بظاہر بے شمار لوگ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں لیکن اگر ان کے دلوں کو ٹٹولا جائے تو وہاں اللہ تعالیٰ کے اقرار کے نشانات ضرور ملیں گے۔

مثال کے طور پر اس کائنات کا سب سے بڑا باغی اور مجرم فرعون تھا جو اپنے آپ کو (رب اعلی) کہا کرتا تھا، وظاہر اللہ تعالیٰ کے وجود کا مسلسل انکار کرتا تھا، موسیٰ علیہ السلام سے کہتا تھا:

[وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٣﴾] [1]

اوررب العالمین کیا ہے؟ مگراس کے اوراس کی قوم کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ] [2]

یعنی: انہوں نے زبانوں سے انکارتو کیامگران کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اوراس کی شریعت کی سچائی کا یقین موجود تھا۔

ایک موقع پرموسیٰ علیہ السلام نے بھی فرعون سے کہا تھا:

[قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ] [3]

یعنی: اے فرعون! تواچھی طرح جانتا ہے کہ انہیں آسمانوں اور زمینوں کے رب نے اتارا ہے۔

② ایمان باللہ کے تعلق سے دوسری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے، جسے توحید ربوبیت کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کواس کے رب ہونے کے اعتبار سے اکیلا ماننا۔

توحید ربوبیت کی تکمیل تین چیزوں سے

علماءِسلف کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کی ربوبیت کی توحید پرمکمل ایمان کیلئے تین چیزوں کو پہچاننااور ماننا ضروری ہے، ان کے بغیر یاان میں سے کسی ایک کے بغیر توحید ربوبیت پرایمان ہرگز کامل نہیں ہوسکتا۔

1 یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پوری کائنات کا خالق ہے، اس کے سوا کوئی خالق نہیں، حتی کہ ایک ذرہ تک کا بھی نہیں۔

[1] الشعراء:۲۳
[2] النمل:۱۴
[3] بنی اسرائیل:۱۰۲

2 یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پوری کائنات کا حقیقی مالک ہے، اس کے سوا کوئی حقیقی مالک نہیں ہے، حتی کہ ایک ذرہ تک کا بھی نہیں۔

3 یہ ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس پوری کائنات کا مدبر اور متصرف ہے، اس کے سوا کوئی مدبر نہیں ہوسکتا۔

توحید ربوبیت پرکامل ایمان کیلئے ان تینوں چیزوں کو ماننا ضروری ہے، لہذا اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اورکو خالق سمجھتا ہے، خواہ ایک ذرہ کی حد تک کیوں نہ ہو، یا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اورکو مالک سمجھتا ہے، خواہ ایک ذرہ کی حد تک کیوں نہ ہو، یا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اورکو مدبر مانتا ہے، خواہ ایک ذرہ کی حد تک کیوں نہ ہو تو اس کی توحید ربوبیت ناقص اورناقابل قبول ہے، تمام تر دعووں کے باوجود اس کا عقیدہ خلل اور اضطراب کا شکار ہے، جب توحید ربوبیت جوکہ بقیہ تمام اقسام توحید (توحید الوہیت، توحید اسماء وصفات) کی مفتاح بلکہ اساس ہے میں خلل واقع ہوگیا تو اس کا تمام تر ایمان وعقیدہ اور بنابریں ہرقسم کا عمل برباد ہوگیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ] [1]

یعنی: جوشخص ایمان میں کسی انکارکا شکار ہوگیا تو اس کا ہرقسم کا عمل برباد اور رائیگاں ہے۔

③ ایمان باللہ کے تعلق سے تیسری چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت ہے، جسے توحید الوہیت کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے (الہ) یعنی: معبود ہونے میں اسے اکیلا وتنہا ماننا اوراس کی عبادت میں کسی کوشریک نہ ٹھہرانا۔

گویا بندے ازروئے عبادت جوامورانجام دیتے ہیں، مثلاً: دعا، خوف، امید، توکل، استعانت، استعاذہ، استغاثہ، ذبح اورنذر وغیرہ وہ سب اللہ رب العزت کیلئے مخصوص ہیں، اب ان میں سے کوئی

[1] المائدۃ:۵

امر غیر اللہ کیلئے انجام نہیں دیا جاسکتا، حتی کہ کسی ملک مقرب کیلئے بھی نہیں، بلکہ کسی نبی مرسل کیلئے بھی نہیں، کوئی دوسرا بھلا کس شمار میں ہوسکتا ہے؟

④ ایمان باللہ کے تعلق سے چوتھی چیز جس پر ایمان لانا ضروری ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر کما حقہ ایمان لایا جائے، جس کی مختصر آ وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں اور رسول کریم ﷺ نے اپنی سنت مبارکہ میں، اللہ رب العزت کے جو اسماء وصفات بیان فرمادیئے ہیں، انہیں اس طرح مانا جائے جس طرح اس ذات واجب الوجود کے لائق ہے، اور اس ماننے میں تحریف، تعطیل، تکییف اور تمثیل وغیرہ کا کوئی شائبہ تک نہ ہو، اسماء وصفات پر مشتمل نصوص خواہ وہ قرآنی آیات ہوں یا رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہوں، میں اگر کسی قسم کی تحریف کا کوئی عنصر شامل ہوگیا تو ایمان باللہ قطعاً متحقق نہ ہوگا، بلکہ وہ انسان ایمان باللہ کے امتحان میں بری طرح ناکام ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے متعلق سلف صالحین کا عقیدہ

اسماء وصفات کے تعلق سے سلف صالحین کا عقیدہ دو چیزوں پر مشتمل ہے ① اثبات ② تنزیہ۔

اثبات سے مراد یہ ہے کہ ہر صفت کمال، اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے، اس طرح کہ اس اثبات میں تشبیہ کا کوئی شائبہ نہ ہو؛ تاکہ فرقہ ضالہ مشبہہ کا رد ہوجائے۔

تنزیہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر اس صفت سے پاک، مبری اور منزہ مانا جائے جس میں کسی نقص یا عیب کا شائبہ ہو، اس طرح کہ اس تنزیہ میں تعطیل کا کوئی شائبہ شامل نہ ہو؛ تاکہ منکرین صفات مثلاً: جہمیہ اور معتزلہ وغیرہ کا رد ہوجائے۔

اثبات اور تنزیہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اکٹھے مذکور ہیں:

[لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪][1]

یعنی: اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ) میں تنزیہ ہے اور (وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ) میں اثبات ہے، یعنی وہ سنتا اور دیکھتا ہے، کیسے؟ جیسے اس ذات کے لائق ہے۔ کیا اس کا سننا اور دیکھنا مخلوقات کے مشابہ یا مماثل ہے؟ جواب: نہیں؛ کیونکہ (لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ)

توحید کی تین اقسام اور ان کے دلائل

واضح ہو کہ ہم نے ایمان باللہ کے ضمن میں جن تین آخری امور کا ذکر کیا ہے یعنی: اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان، یہ تینوں امور درحقیقت توحید کی تین اقسام ہیں۔

توحید کی ان تین اقسام کا علم، کتاب وسنت کے نصوص سے استقراءً حاصل ہوتا ہے، صرف قرآن پاک کی پہلی اور آخری سورتوں کے مطالعہ سے ہی یہ نکتہ واضح ہوجائے گا۔

پہلی سورت، سورۃ الفاتحہ ہے، جسے ام القرآن اور السبع المثانی اور القرآن العظیم جیسے القاب حاصل ہیں، یہ سورت توحید کا مکمل تعارف پیش کرتی ہے، چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں توحید سے متعلق ہر نص، توحید کی انہی تین اقسام میں سے کسی قسم پر مشتمل ہے۔

چنانچہ (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) میں (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ) توحید الوہیت ہے؛ کیونکہ بندہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہے، جو کہ اس ذات کی عبادت قرار پائے گی، (رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ) توحید ربوبیت ہے۔

(اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) میں توحید اسماء وصفات کا بیان ہے، (مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ) میں توحید ربوبیت ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر شیٔ کا مالک ہونا اس کی ربوبیت کے ضمن میں آتا ہے،

[1] الشوریٰ: ۱۱

کما تقدم۔ پھر چونکہ (مَالِكِ) اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، لہٰذا اس آیت کریمہ کا شمار توحید اسماء وصفات کے تحت بھی ممکن ہے۔

(اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) میں (اِیَّاكَ نَعْبُدُ) توحید الوہیت کے علم پر مشتمل ہے جبکہ (وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) توحید ربوبیت کو متضمن ہے۔

(اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ) جملہ دعائیہ ہے، جو کہ بندے کا فعل ہے اور عین عبادت ہے، لہٰذا اس کا تعلق بھی توحید الوہیت سے ہے۔

توحید ربوبیت اور توحید الوہیت میں فرق کی ایک صورت

واضح ہو کہ توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کے مابین فرق کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عبادت کے تعلق سے بندوں کے جملہ افعال مثلاً: قیام، قرات، رکوع، سجود، ذکر، تشہد، عمرہ، حج، روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ توحید الوہیت ہیں اور اللہ تعالیٰ کے تمام افعال جو وہ مخلوقات کیلئے انجام دیتا ہے سب توحید ربوبیت ہیں، گویا تمام افعال اللہ، توحید ربوبیت ہیں اور تمام افعال العبد للہ، توحید الوہیت ہیں۔

ضروری ہے کہ بندے عبادت کے تعلق سے جو امور انجام دیتے ہیں ان میں توحید کے تقاضے پورے کریں اور ہر قسم کے شرک سے گریز کریں، اسی طرح ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں اسے یکتا، اکیلا اور وحدہ لاشریک لہ مانا جائے۔ تاکہ اس طرح توحید کی دونوں اقسام کے تعلق سے شرک سے بچاؤ ممکن ہو سکے۔

ہم نے گذشتہ سطور میں اقسام توحید کی معرفت کیلئے قرآن پاک کی پہلی اور آخری سورت کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا سرسری جائزہ ذکر ہو چکا، آخری سورت، سورۃ الناس ہے، اس میں بھی توحید کی انہی تینوں اقسام کا ذکر ملے گا۔

چنانچہ قولہ تعالیٰ: (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) میں اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کا ذکر ہے، جو

اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، لہٰذا یہ توحید الوہیت ہوا، (بِرَبِّ النَّاسِ) توحید ربوبیت بھی ہے اور توحید اسماء وصفات بھی۔

(مَلِكِ النَّاسِ) بھی اسی طرح توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات دونوں کو ثابت کر رہا ہے۔

(اِلٰهِ النَّاسِ) میں توحید الوہیت کا اثبات بھی ہے اور توحید اسماء وصفات کا بھی۔

توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات، توحید الوہیت کو مستلزم ہیں

انبیاء کرام کی اصل دعوت کا محور (توحید الوہیت) ہے، اور توحید الوہیت پر مکمل ایمان، توحید ربوبیت اور توحید اسماء وصفات کے اقرار کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا ربوبیت اور اسماء وصفات پر ایمان، درحقیقت توحید الوہیت پر ایمان کو متلزم ہے۔

قولہ تعالیٰ: (یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ) سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو جائے گی۔

مزید وضاحت کیلئے سورۃ النمل کی آیت نمبر ۶۰ تا ۶۴ کا مطالعہ کیا جائے۔

[اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾ اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَمَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۶۴﴾]

ترجمہ:” (کیا یہ خود ساختہ معبود بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا؟ پھر ہم نے اس (پانی) سے پر رونق باغات اگائے، کہ تمہیں ان (باغات) کے درخت اگانے کی (قدرت) نہ تھی کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (اللہ کے) برابر (ہمسر) ٹھہراتے ہیں (کیا یہ خود ساختہ معبود بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جس نے زمین کو ٹھہرنے کے لائق بنایا اور اس کے درمیان نہریں بنادیں اور اس کیلئے مضبوط پہاڑ بنادیئے اور دو سمندروں کے درمیان آڑ بنادی، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (نہیں) بلکہ ان کے اکثر علم نہیں رکھتے (کیا یہ خود ساختہ معبود بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو لاچار کی (دعا) قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور وہ برائی دور کردیتا ہے اور وہ تمہیں زمین میں جانشین بناتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو (کیا یہ خود ساختہ معبود بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو تمہیں خشکی اور تری کے اندھیروں میں راہ دکھاتا ہے اور وہ جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوشخبری دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے، کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ اللہ برتر ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں (کیا یہ خود ساختہ معبود بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو مخلوق کو پہلی بار پیدا کرتا ہے اور پھر وہ اسے لوٹائے گا اور وہ جو تمہیں آسمان وزمین سے رزق دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ کہہ دیجئے اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ“

ان پانچوں آیات میں توحید ربوبیت سے متعلق بہت سے امور کی تقریر موجود ہے، مثلاً: زمین وآسمان کا خلق، آسمان سے بارش برسانا، اس بارش کے نتیجہ میں باغات پیدا کرنا، زمین کو قرار بخشنا، نہروں کا نظام چلانا، پہاڑوں کی تخلیق، بروبحر کی ظلمات میں راہنمائی اور آسمان وزمین سے رزق کی عطاوغیرہ، یہ سب امور ربوبیت ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور کے ذکر کے سیاق میں باربار یہ سوال فرمایا ہے: ﴿ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ہوسکتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ذات ان تمام امور

ربوبیت کی خلق وایجاد میں وحدہ لاشریک لہ ہے، ضروری ہے کہ وہی ذات معبود ہونے میں بھی وحدہ لاشریک لہ ہو۔

تبھی تو اس پوری کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ نے ہر شئ کے خالق ہونے اور ہر شئ کے مالک ہونے اور ہر شئ کے مدبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے، یہ دعویٰ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکا۔ تو پھر ضروری ہے کہ صرف اسی ذات برحق کو معبودِ حق مانا جائے، اس کے سوا معبود کھڑے کئے گئے ہیں مگر سب کے سب باطل ہیں۔ [ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ][1]

ایمان کے رکن اول (ایمان باللہ) کے حوالے سے کچھ بنیادی باتیں، رقم کی گئی ہیں، مزید تفصیل کیلئے ہماری تمام کتب جن کا موضوع عقیدہ ہی ہے کی طرف مراجعت کرلی جائے، بالخصوص کتاب (توحید الٰہ العالمین) اس موضوع پر کافی وشافی مواد مہیا کرے گی۔ (ان شاء اللہ)

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] لقمان:۳۰

ایمان کا دوسرا رکن: فرشتوں پر ایمان

ایمان کا دوسرا رکن (ایمان بالملائکۃ) ہے، (ملائکہ) ملک (بفتح اللام) کی جمع ہے، جس کا معنی فرشتہ ہے، فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا فرض ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ] [1]

یعنی: نیکی تو اللہ تعالیٰ، روزِ آخرت، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لانے کا نام ہے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کی حقیقت

فرشتوں پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ ان کے موجود ہونے کی تصدیق کی جائے اور یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں [عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ] [2] یعنی باعزت بندے قرار دیا ہے۔ گویا فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور ان پر ہمارا ایمان اس وقت تک درست اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان تمام امور و افعال کو تسلیم نہ کر لیا جائے، جو ان کے بارہ میں کتاب و سنت میں وارد ہوئے ہیں۔ اور یہ تسلیم کرنا، ہر زیادتی یا کمی یا تحریف وغیرہ سے پاک ہو۔

فرشتوں کے وجود کا انکار یا ان کے اعمال و افعال جو انہیں تفویض کئے گئے ہیں، کا انکار کفر ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾] [3]

---

[1] البقرۃ:۱۷۷
[2] الانبیاء:۲۶
[3] النساء:۱۳۶

یعنی: جو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا وہ پرلے درجے کا گمراہ ہے۔

فرشتے نوری مخلوق ہیں

ملائکہ کی خلقت نور سے ہوئی ہے، صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے (خلقت الملائکۃ من نور وخلق الجان من نار وخلق آدم مما وصف لکم) [1]

یعنی: فرشتے نور سے، جن آگ سے پیدا کئے گئے ہیں اور انسان اس (مادہ) سے جس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

نوری مخلوق ہونے کی وجہ سے فرشتے کھانے پینے سے مستغنی اور بے نیاز ہیں۔ سورۃ الذاریات کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ کچھ فرشتے، ابراہیم علیہ السلام کے پاس بصورت بشر آئے تھے، ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کھانا پیش کیا، جسے فرشتوں نے نہیں کھایا تھا، جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ کھانے کیلئے ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے تو انہوں نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا، جس پر فرشتوں نے اپنی حقیقت سے آگاہ کر دیا یعنی ہم فرشتے ہیں۔ (کھانے پینے سے بے نیاز ہیں)

سورۂ فاطر کی آیت کے مطابق فرشتے، پروں والی مخلوق ہیں، جبکہ نبی علیہ السلام کے فرمان کے مطابق، جبریل علیہ السلام کے 600 پر ہیں۔

فرشتوں کی تعداد

فرشتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کا احصاء اور شمار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان کی کثرت تعداد کا اندازہ نبی علیہ السلام کی اس حدیث سے ہوتا ہے: بیت المعمور (جو ساتویں آسمان پر فرشتوں کی مسجد ہے) میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، جو قیامت تک دوبارہ داخل نہ ہو سکیں گے۔ [2]

---

[1] صحیح مسلم:۲۹۹۶
[2] صحیح بخاری:۳۲۰۷، صحیح مسلم:۲۵۹

ایک اور حدیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن چار ارب نوے کروڑ فرشتے جہنم کو کھینچ کر لائیں گے۔

عن عبد الله بن مسعود رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: (يؤتى بجهنم يومئذ لها سبعون الف زمام, مع كل زمام سبعون الف ملك يجرونها)[1]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار لگامیں ہونگی، ہر لگام پر ستر ہزار فرشتے مامور ہونگے جو جہنم کو گھسیٹ کر لائیں گے۔

اس کے علاوہ جامع ترمذی اور مسند احمد میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی منقول ہے:

(أطت السماء وحق لها أن تئط, مامن موضع أربع أصابع منها إلا وفيه ملك قائم لله أو راكع أو ساجد)[2]

یعنی: آسمانوں میں فرشتوں کے (کثیر التعداد ہونے کے باعث ان کے وزن کی وجہ سے) مسلسل چرچراہٹ پیدا ہوتی رہتی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ آسمانوں میں چار انگلیوں کے برابر بھی کوئی جگہ خالی نہیں، جہاں کوئی فرشتہ اللہ تعالیٰ کے سامنے قیام، یا رکوع یا سجود میں مشغول نہ ہو۔

یہ تمام نصوص فرشتوں کے کثیر التعداد ہونے پر دال ہیں۔

سردار فرشتوں کا بیان

تمام ملائکہ کے سردار، تین فرشتے ہیں: (۱) جبریل (۲) میکائیل (۳) اسرافیل علیہم السلام

رسول اکرم ﷺ اپنی رات کی نماز کا افتتاح اس دعا سے کیا کرتے تھے:

(اللهم رب جبريل وميكائيل واسرافيل, فاطر السموات والارض, عالم

[1] صحیح مسلم: ۲۸۴۲
[2] جامع ترمذی: ۲۳۱۲، ابن ماجہ: ۴۱۹۰، مسند احمد: ۵/۱۷۳

الغيب والشهادة, أنت تحكم بين عبادك فيما كانوا فيه يختلفون ...الحديث)[1]

یعنی: اے اللہ! اے جبریل، میکائیل اور اسرافیل کے رب! اے آسمانوں اور زمینوں کے پیدا کرنے والے! اے عالم الغیب والشہادۃ، تو اپنے بندوں کے بیچ، جن چیزوں میں وہ اختلاف کرتے ہیں، کا فیصلہ فرمانے والا ہے......الحدیث

اس حدیث میں تینوں رؤساء الملائکہ کا ذکر ہے۔ رسول اکرم ﷺ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کو ان تینوں فرشتوں کے رب ہونے کا واسطہ دیتے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ تینوں فرشتے کسی نہ کسی طور حیات یعنی زندگی بہم پہنچانے پر مقرر و مامور ہیں، چنانچہ جبریل علیہ السلام مامور وحی ہیں جو حیات قلوب کا پیغام ہے، جبکہ میکائیل علیہ السلام بارش برسانے پر مامور ہے جو زمین اور اس پر بسنے والے جانداروں اور پودوں وغیرہ کی حیات ہے، اور اسرافیل کی ڈیوٹی نفخ صور پر ہے، جس کے دوبارہ پھونکے جانے کے بعد تمام مخلوق جو موت کا شکار ہو چکی تھی زندہ ہو جائے گی۔

فرشتوں کے منصوص نام

واضح ہو کہ گو فرشتے اللہ تعالیٰ کی کثیر التعداد مخلوق ہیں، مگر ہمیں ان میں سے بہت کم فرشتوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے، عالم غیبی ہیں، جن کی ہر خبر کا انحصار اللہ تعالیٰ کی وحی پر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی وحی سے چند فرشتوں کے نام ثابت ہیں۔

①، ② جبریل اور میکائیل علیہما السلام کے نام سورۃ البقرۃ کی اس آیت میں مذکور ہیں:

[مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿98﴾][2]

[1] صحیح مسلم
[2] البقرۃ: ۹۸

③ اسرافیل علیہ السلام کا نام قرآن میں مذکور نہیں ہے، البتہ مذکورۃ الصدر حدیث میں ان کا نام موجود ہے۔

④ مالک: یہ جہنم کا داروغہ ہے اور اس کا نام قرآن مجید میں موجود ہے:

[وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ] [1]

اس کے علاوہ صحیح بخاری میں سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث، جس میں رسول اللہ ﷺ کے ایک طویل خواب کا ذکر ہے، میں بھی مالک کا نام مذکور ہے۔

⑤، ⑥ ہاروت وماروت: یہ دونوں نام قرآن پاک کی اس آیت میں مذکور ہیں۔

[وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ] [2]

⑦، ⑧ منکرونکیر: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قبر میں میت سے سوالات کے تعلق سے منکرونکیر دو فرشتوں کا ذکر احادیث میں معروف ہے، چنانچہ جامع ترمذی میں ہے (اذا قبر المیت أتاہ ملکان أسودان ازرقان یقال لأحدھما: المنکر وللآخر: النکیر... الحدیث)

یعنی: جب میت کو قبر میں دفن کردیا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں جو سیاہ اور نیلے رنگوں کے ساتھ (خوفناک شکل دھارے ہوتے ہیں) ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے۔

⑨ عزرائیل: حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: موت پر مقرر فرشتے کا نام قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے، البتہ بعض آثار سلف میں اس کا عزرائیل نام مذکور ہے۔ [3]

---

[1] الزخرف:۷۷
[2] البقرۃ:۱۰۲
[3] البدایہ والنہایہ ۱/۴۲

فرشتوں کی صفاتِ خلقیہ

ملائکہ کی جو صفاتِ خَلقیہ، کتاب وسنت سے ثابت ہوتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ نور سے پیدا ہوئے ہیں اور ان کی تخلیق آدم علیہ السلام جو ابوالبشر ہیں سے مقدم ہے، وہ انتہائی خوبصورت ہیں، عظیم الہیکل اور قوی الجثہ ہیں، رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق ایک بار آپ ﷺ نے جبریل امین کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا، انہوں نے تمام افق سماوی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ [1]

سنن ابی داؤد میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أذن لی أن أحدث عن ملک من ملائکۃ اللہ من حملۃ العرش ،أن ما بین شحمۃ أذنیہ إلی عاتقیہ مسیرۃ سبع مأئۃ عام)

یعنی: مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالی کے ان فرشتوں میں سے جو عرش اٹھائے ہوئے ہیں، ایک فرشتے کا تعارف پیش کروں، اس کے کانوں کی لو سے لیکر کندھوں تک کا فاصلہ سات سو سالوں کے سفر کی مسافت کے بقدر ہے۔

فرشتوں کا اپنی شکل تبدیل کرلینا

فرشتے اللہ تعالی کے حکم سے اپنی شکل تبدیل کرکے، کوئی دوسرا روپ دھار سکتے ہیں، جیسا کہ مریم کے پاس جبریل علیہ السلام کی آمد کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

[وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ڎ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝] [2]

یعنی: اور کتاب میں مریم کا ذکر کر جب وہ مشرقی جانب اپنے اہل سے دور ایک جگہ پردہ

---

[1] جامع ترمذی
[2] مریم:۱۶،۱۷

میں بیٹھ گئیں تو ہم نے ان کی طرف اپنے روح (جبریل علیہ السلام) کو بھیجا جو ایک مکمل مرد کا روپ دھار کران کے پاس پہنچے۔

نیز حدیث زیرِ بحث (حدیث جبریل) میں بھی جبریل علیہ السلام کا رسول اللہ ﷺ کے پاس بصورت بشر آنا مذکور اور ثابت ہے۔

فرشتوں کی رفتار کی سرعت وتیزی

ملائکہ کی رفتار کی سرعت اور تیزی کا اندازہ انسانی قیاسات وآلات سے انتہائی بعید ہے، احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ بعض اوقات کوئی سائل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا سوال عرض کرتا اور اس کے سوال کے مکمل ہونے سے پہلے ہی جبریل علیہ السلام اللہ رب العزت سے جواب لیکر تشریف لے آتے۔

فرشتوں کے اعمال وافعال

فرشتے دن رات کسی تھکاوٹ یا اکتاہٹ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہیں، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

[يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝] [1]

یعنی: وہ رات دن اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف ہیں اور تھکتے نہیں ہیں۔

فرشتے اللہ تعالیٰ کی اطاعت گذار مخلوق ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ کی کسی نافرمانی کا کوئی تصور نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝] [2]

یعنی: وہ اللہ تعالیٰ کے کسی امر کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم

[1] الانبیاء:۲۰
[2] التحریم:۶

دیا جاتا ہے۔

چنانچہ کچھ فرشتے مأمور بالوحی ہیں، کچھ مأمور بالمطر (بارش) ہیں، کچھ کی ڈیوٹی رحم مادر میں ہے، کچھ فرشتوں کو جنت سے متعلق امور سونپے گئے ہیں، کچھ جہنم پر مقرر کئے گئے ہیں، اور کچھ کی دیگر ڈیوٹیاں ہیں۔

ہر فرشتہ اپنی تفویض کردہ ڈیوٹی کسی تاخیر یا نافرمانی کے بغیر خوب نبھارہا ہے:

[عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝] [1]

یعنی: وہ بڑے ہی معزز بندے ہیں، کسی بات تک میں اللہ تعالیٰ سے سبقت نہیں کرتے اور اسی کے امر کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ قولہ تعالیٰ: [فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا] [2] کی تفسیر میں فرماتے ہیں آسمانوں اور زمینوں میں، سورج، چاند، ستاروں، بادلوں، ہواؤں، نباتات اور حیوانات سے صادر ہونے والی ہر حرکت، ملائکہ موکلین کی تنفیذ سے رونما ہوتی ہے (جو خالق ومالک کی اطاعت کا مظہر ہے)

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں: کتاب وسنت اس بات پر شاہد ہے کہ بہت سے ملائکہ کو مختلف مخلوقات پر ڈیوٹی سونپی گئی ہے، چنانچہ کچھ ملائکہ پہاڑوں پر مامور ہیں، کچھ بادلوں اور بارش پر، کچھ سورج چاند ستاروں پر، کچھ جہنم پر تاکہ اس کی آگ کو جلاتے رہیں اور اس میں آنے والوں کو عذاب دیتے رہیں، کچھ فرشتے جنت پر مامور ہیں تاکہ اس کے حسن، نعمتوں، نہروں کے اجراء اور باغات کی تیاری جیسی خدمات انجام دیتے رہیں، کچھ ملائکۃ الرحمۃ ہیں، کچھ ملائکۃ العذاب ہیں، کچھ ملائکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عرش کو اٹھانے پر مامور ہیں، جبکہ ملائکہ کی ایک کثیر تعداد کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی ہے کہ وہ اپنی نمازوں اور تحمیدات وتسبیحات کے ذریعے آسمانوں کو آباد رکھیں۔

[1] الانبیاء:۲۶،۲۷
[2] النزعات:۵

ان تمام امور کی انجام دہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت کا نتیجہ ہے۔

فرشتوں کی عبادات

فرشتے ،جنہیں بلا استثناء (عباد مکرمون) ہونے کا شرف حاصل ہے،کسی تعطل کے بغیر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں،ان کی عبادت کی بہت سی صورتیں کتاب وسنت سے ثابت ہوتی ہیں:

① خشیت: جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۲۸][1]

یعنی: فرشتے اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔

نیز فرمایا:[وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ][2]

یعنی: تسبیح بیان کرتی ہے بادلوں کی گرج اس کی حمد کے ساتھ اور فرشتے تسبیح بیان کرتے ہیں اس کی خشیت سے۔

فرشتوں کی مسلسل خشیت اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیت کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے:

عن جابر رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال :مررت لیلة أسری بالملأ الاعلی وجبریل کالحلس البالی من خشیة اللہ تعالی.

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں معراج کی رات الملأ الاعلیٰ (فرشتوں کی سب سے عالی رتبہ جماعت) کے پاس سے گذرا،جبریل علیہ السلام،اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے ایک بوسیدہ چادر کی طرح (کمزور) دکھائی دیئے۔

یہ حدیث طبرانی اوسط میں ہے اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے صحیح الجامع الصغیر میں اس کی سند کو حسن

[1] الانبیاء:۲۸
[2] الرعد:۱۳

قرار دیا ہے۔(رقم الحدیث:۵۸۶۲)

② فرشتوں کی دوسری عبادت،ذکر اللہ وارد ہوئی ہے اور ذکر اللہ میں زیادہ تر تسبیح کا ذکر ہے:

[وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ][1]

یعنی: فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

[يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ][2]

یعنی: فرشتے رات دن تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔

حاملین عرش اور عرش کے اردگرد فرشتوں (الکروبیین) کے بارہ میں فرمایا:

[اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ][3]

یعنی: جو فرشتے عرش اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے اردگرد ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔

عن ابی ذر رضی اللہ عنہ قال سئل رسول اللہ ﷺ أی الذکر أفضل ؟قال: ما اصطفی اللہ لملائکته أو لعبادہ (سبحان اللہ وبحمدہ)[4]

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا ذکر سب سے افضل ہے؟ فرمایا: وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں یا نیک بندوں کیلئے چُن لیا ہے،یعنی (سبحان اللہ وبحمدہ)

③ فرشتوں کی عبادت میں نماز کا ذکر بھی ملتا ہے،چنانچہ صحیح بخاری میں مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے مروی،حدیث اسراء میں ہے:

[1] الشوری:۵
[2] الانبیاء:۲۰
[3] غافر:۷
[4] صحیح مسلم

رسول اللہ ﷺ کو البیت المعمور دکھایا گیا، آپ ﷺ نے اس کی بابت جبریل علیہ السلام سے پوچھا، توانہوں نے فرمایا: یہ بیت المعمور (جو ساتویں آسمان پر فرشتوں کی مسجد ہے) ہے جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز ادا کرتے ہیں، جو قیامت تک دوبارہ اس میں داخل نہ ہوسکیں گے۔[1]

فرشتوں کے نماز ادا کرنے کا ذکر اس معروف حدیث میں بھی ہے، جس میں فرشتوں کی صف بندی کا بیان ہے۔[2]

اس کے علاوہ فرشتوں کے قیام اور سجود کا ذکر بھی احادیث میں وارد ہے، چنانچہ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے: آسمانوں میں ایک بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں جہاں فرشتہ محوِ سجود و قیام نہ ہو۔

فرشتوں کا انسان کے ساتھ تعلق

انسان کی تخلیق سے لیکر قبضِ روح تک جملہ مراحل، فرشتوں کے سپرد کئے گئے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے امر سے ہر مرحلے کے ہر کام کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم کی حدیث بروایت انس بن مالک، میں مذکور ہے کہ رحمِ مادر میں ایک فرشتہ مقرر ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر سے نطفہ سے علقہ (خون کا لوتھڑا) اور علقہ سے مضغہ (گوشت کی بوٹی) جیسے مراحل تبدیل کرتا، پھر اسے اللہ تعالیٰ کے امر سے مذکر یا مؤنث بناتا ہے، اللہ تعالیٰ کے امر سے اس کے رزق اور وقتِ موت کی تحدید کرتا ہے اور اس کے شقی (بدبخت) یا سعید (نیک بخت) ہونے کا فیصلہ کرتا ہے، یہ سب باتیں ماں کے پیٹ میں طے ہوجاتی ہیں، جن کی تنفیذ فرشتے کے ذریعے ہوتی ہے۔

بہت سے فرشتے انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں:

[1] صحیح بخاری: ۳۲۰۷، صحیح مسلم: ۲۵۹
[2] صحیح بخاری

[لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ] [1]

یعنی: انسان کیلئے بہت سے باری باری آنے والے فرشتے ہیں جو اس کے آگے اور پیچھے سے آتے ہیں اور اللہ کے امر سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: بہت سے فرشتے انسان کے آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور جب اس کی موت کیلئے اللہ تعالیٰ کا امر آجاتا ہے تو وہ فرشتے اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

بہت سے فرشتے انسانوں کے اعمال، خواہ وہ خیر ہوں یا شر، کی کتابت وحفاظت پر مامور ہیں:

[وَاِنَّ عَلَيۡكُمۡ لَحٰـفِظِيۡنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيۡنَ ۙ يَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ] [2]

یعنی: بے شک تم پر حفاظت کرنے والے ملائکہ مقرر ہیں، جو عزت والے ہیں اور (تمہارے اعمال) لکھنے والے ہیں، تم جو کچھ کرتے ہو اسے خوب جاننے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر دو فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے: ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف، یہ دونوں فرشتے اس کی زبان کے ہر بول اور جسم کے ہر عمل کو شمار کرتے رہتے ہیں:

[اِذۡ يَتَلَقَّى الۡمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيۡدٌ ۞ مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ] [3]

یعنی: جب ضبط کرتے ہیں دو ضبط کرنے والے ایک دائیں پہلو میں (بیٹھا ہوا) اور (دوسرا) بائیں پہلو میں بیٹھا ہوا نہیں بولتا وہ (انسان) کوئی بات مگر اس کے پاس ہوتا ہے ایک نگران (فرشتہ) تیار (لکھنے کیلئے)

عظیم تابعی امام حسن البصری رحمہ اللہ ان آیات کی تلاوت کرکے فرمایا کرتے تھے: اے آدم

[1] الرعد: ۱۱
[2] الانفطار: ۱۰/۱۲

کے بیٹے! تیرے لئے صحیفہ پھیلا دیا گیا ہے اور دو معزز فرشتے تجھ پر مقرر کر دیئے گئے ہیں: ایک تیرے دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف، جو فرشتہ تیرے دائیں طرف ہے وہ تیری نیکیوں کی حفاظت وکتابت کر رہا ہے اور جو فرشتہ تیرے بائیں طرف ہے وہ تیرے گناہوں کی نگرانی کر رہا ہے، اب تیری مرضی تو جو چاہے عمل کر، زیادہ کر یا کم، پھر جب تو مر جائے گا تو تیرے اس صحیفہ کو لپیٹ کر تیری گردن میں لٹکا دیا جائے گا جو قبر میں تیرے ساتھ رہے گا، پھر جب قیامت قائم ہوگی تو، تو اسے اپنے ساتھ لیکر قبر سے باہر نکلے گا۔

واضح ہو کہ یہ فرشتے جس طرح انسان کے قول اور ظاہری عمل سے آگاہ ہوتے ہیں، اسی طرح انسان کے قلبی اعمال اور نیت وغیرہ کو بھی جانتے ہوتے ہیں، جس کی ایک دلیل تو قولہ تعالی یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ کا عموم ہے اور دوسری دلیل نبی ﷺ کا یہ فرمان ہے:

(قالت الملائكة ذاك عبد يريد أن يعمل سيئة وهو أبصر به فقال: إرقبوه فإن عملها فاكتبوها بمثلها وإن تركها فاكتبوها له حسنة إنما تركها من جرائي)[1]

یعنی: فرشتے اللہ تعالی سے کہتے ہیں: یہ بندہ کسی برائی کے ارتکاب کا ارادہ رکھتا ہے، اللہ تعالی خود خوب دیکھنے والا ہے، وہ فرماتا ہے: اس بندہ کی نگرانی کرو اگر وہ برائی کر بیٹھا تو ایک ہی گناہ تحریر کر دینا اور اگر اس برائی کے ارتکاب سے باز رہا تو اس کے بدلے ایک نیکی لکھ دینا؛ کیونکہ اس نے اس گناہ کو میرے خوف کی بناء پر ترک کیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو بندے کے دل کے ارادے اور نیت کی خبر ہوتی ہے۔

فرشتوں کی ایک خاص ڈیوٹی (روح انسانی کا قبض)

اللہ تعالی نے روحِ انسانی کے قبض کیلئے بھی فرشتے مامور فرمائے ہیں، چنانچہ جس انسان کی

[1] بخاری ومسلم

اجل حاضر ہوتی ہے، مقرر کردہ فرشتہ اس کی روح قبض کرتا ہے:

[قُلۡ يَتَوَفّٰىكُمۡ مَّلَكُ الۡمَوۡتِ الَّذِىۡ وُكِّلَ بِكُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ ۝۱۱][1]

یعنی: کہہ دیجئے! تمہیں ملک الموت، جو تم پر مقرر ومامور ہے، موت دیتا ہے، پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

نیز فرمایا: [وَهُوَ الۡقَاهِرُ فَوۡقَ عِبَادِهٖ وَيُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الۡمَوۡتُ تَوَفَّتۡهُ رُسُلُنَا وَهُمۡ لَا يُفَرِّطُوۡنَ ۝۶۱][2]

یعنی: اور وہی غالب ہے اوپر اپنے بندوں کے اور بھیجتا ہے تم پر محافظ (فرشتے) حتی کہ جب آتی ہے تم میں سے کسی ایک کو موت (تو) فوت کرتے ہیں اسے ہمارے رسول (فرشتے) اور وہ نہیں کوتاہی کرتے۔

کتاب وسنت کے نصوص سے یہ بات معلوم ہے کہ روح قبض کرنے والے فرشتے، کافروں اور مجرموں کی روحوں کو انتہائی سختی اور اذیت کے ساتھ قبض کرتے ہیں، جبکہ مؤمنین صالحین کی روحیں بہت ہی رفق وسہولت کے ساتھ قبض ہوتی ہیں۔

چنانچہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندۂ مومن کے دنیا سے انقطاع اور آخرت کی طرف سفر کا وقت آتا ہے تو انتہائی روشن چہروں والے فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ان کے چہرے سورج کی طرح پر نور ہوتے ہیں، ان کے ساتھ جنت کا کفن ہوتا ہے نیز جنت کی خوشبو بھی، وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں، حتی کہ ملک الموت آتا ہے اور اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: اے نفسِ طیبہ! اللہ تعالی کی مغفرت اور رضا کی طرف رواں دواں ہو جا، چنانچہ اس کی روح جسم سے نکلتی ہے، اس قدر آسانی کے ساتھ جیسے پانی کا قطرہ

[1] السجدہ: ۱۱
[2] الانعام: ۶۱

مشکیزے کے منہ سے خارج ہوتا ہے، چنانچہ جنت سے آئے ہوئے فرشتے اس روح کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں......الخ

جبکہ کافر یا فاجر بندے کا جب یہ وقت آتا ہے تو آسمان سے انتہائی سخت، سیاہ چہروں والے فرشتے اترتے ہیں، ان کے ساتھ جہنم کے انتہائی کھردرے ٹاٹ ہوتے ہیں، وہ فرشتے کچھ فاصلے پر بیٹھ کر اس کی روح کے قبض ہونے کا انتظار کرتے ہیں، چنانچہ ملک الموت پہنچ جاتا ہے اور اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتا ہے: اے نفس خبیثہ! اپنے پروردگار کی ناراضگی اور غضب کی طرف چل پڑ، اس کی روح اس کے پورے جسم میں پھیل جاتی ہے، جسے وہ فرشتہ یوں کھینچ کر نکالتا ہے جیسے بھیگی ہوئی اون میں لپٹی لوہے کی سلاخ نکالی جاتی ہے۔[1]

قبض روح کے بعد، قبر میں دفن کا مرحلہ آتا ہے اور دفن کے فوری بعد میت سے سوال وجواب کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، یہ ڈیوٹی بھی فرشتوں کو تفویض کی گئی ہے، چنانچہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان موجود ہے:

اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا لیتے ہیں اور یہ تین سوال کرتے ہیں:

من ربک؟ ما دینک؟ من نبیک؟

یعنی: تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟

یہ مؤمن پر وارد ہونے والا آخری فتنہ ہے (اس کے بعد کوئی فتنہ نہ ہوگا) اس وقت کیلئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ] [2]

---

[1] مسند احمد
[2] ابراھیم: ۲۷

یعنی: اللہ تعالیٰ ثابت (کلمہ لاالٰہ الا اللہ) کی برکت سے دنیا میں اور آخرت میں ثابت قدمی عطا فرماتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ثابت قدمی پر مؤمن ان سوالوں کے جواب یوں دیگا۔

(ربی اللہ، ودینی الاسلام، ونبیی محمد ﷺ)

یعنی: میرا رب اللہ ہے، اور میرا دین اسلام ہے اور میرا نبی محمد ﷺ ہے۔

جس پر آسمان سے پکارنے والا (اللہ رب العزت) پکارے گا: میرے بندے نے سچ کہا......

اور کافر یا فاسق بندے کے بارہ میں فرمایا: اس کے پاس قبر میں دو فرشتے آئیں گے، اسے بٹھا لیں گے اور پوچھیں گے: من ربک؟

یعنی: تیرا رب کون ہے؟

وہ اس سوال کے جواب میں کہے گا: ھاہ ھاہ لا أدری

یعنی: ہائے تعجب اور افسوس ہے کہ میں نہیں جانتا۔

پھر فرشتے پوچھیں گے جو نبی تم میں مبعوث ہوا اس کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ اسے اس نبی کا نام بتانے کی توفیق نہیں ملے گی، حتی کہ پوچھا جائے گا کہ کیا وہ محمد ﷺ ہیں؟ وہ جواب دے گا: ھاہ ھاہ لا أدری۔ یعنی: ہائے تعجب اور افسوس ہے کہ میں نہیں جانتا، میں تو لوگوں کو یہ بات کرتے ہوئے سنتا تھا، فرشتے کہیں گے: نہ تو نے کچھ جانا نہ پڑھا، اسی وقت آسمان سے ندا آئے گی: یہ بندہ انتہائی جھوٹا اور بدکردار ہے......

فرشتوں کا مؤمنین کے ساتھ خصوصی تعلق

گذشتہ سطور میں ہم نے فرشتوں کے انسان کے ساتھ عمومی تعلق پر بات کی تھی، اب یہ بتائیں کہ فرشتوں کا اہلِ ایمان کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے، اس تعلق کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے،

اور یہ تعلق اللہ تعالیٰ کے حکم سے قائم ہوتا ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا انتہائی آسان ہوگا کہ یہ تعلق کتنا گہرا، مضبوط اور قوی ہوگا، نیز یہ کہ یہ تعلق محض وقتی یا عارضی نہیں ہے بلکہ انسان کے سفر حیات کے تمام مراحل میں بالاستمرار قائم رہتا ہے، بلکہ مرنے کے بعد بھی۔

محبت سے لبریز اس تعلق کی نوعیت حدیث ذیل سے عیاں ہوتی ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ :إن الله تبارك وتعالى إذا أحب عبدا نادى جبريل: إن الله قد أحب فلانا فأحبه. فيحبه جبريل،ثم ينادي جبريل في السماء :إن الله قد أحب فلانا فأحبوه . فيحبه أهل السماء ويوضع له القبول في الأرض

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبریل امین کو نداء فرماتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرنے لگا ہے لہذا تو بھی اس سے محبت کر، چنانچہ جبریل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبریل تمام آسمانوں میں پکارتے ہیں: (اے فرشتو!) بے شک اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرنے لگا ہے لہذا تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ آسمانوں کے تمام فرشتے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس بندے کا قبول ورضا زمین پر بھی اتار دیا جاتا ہے۔

فرشتوں کے مؤمن بندوں کے ساتھ خصوصی تعلق کی چند صورتیں

① اہلِ ایمان کو خیر کی ترغیب دیتے رہنا

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ إذا أوى الإنسان إلى فراشه إبتدره ملك وشيطان،فيقول الملك: إختم بخير،ويقول الشيطان:إختم بشر. فإذا ذكر الله تعالى حتى يغلبه (يعني النوم)طرد الملك الشيطان وبات يكلأه...الحديث

جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان رات سونے کیلئے اپنے بستر

پر آتا ہے تو اس سے قبل ہی وہاں ایک فرشتہ اور ایک شیطان موجود ہوتا ہے، فرشتہ کہتا ہے: اپنے دن کی مصروفیات کا خاتمہ اچھے عمل سے کرو، اور شیطان کہتا ہے: برے عمل سے کرو، اگر وہ بندہ فرشتہ کی نصیحت قبول کرکے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے حتی کہ اس پر نیند غالب آجائے تو فرشتہ اس شیطان کو بھگا دیتا ہے اور رات بھر اس بندے کی حفاظت کرتا ہے۔ (مستدرک حاکم، مسند ابی یعلی امام ہیثمی نے مجموع الزوائد میں اس کے تمام رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے)

② اہلِ ایمان کیلئے دعا اور استغفار کرتے رہنا

[اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ۭ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝][1]

ترجمہ: وہ (فرشتے) جو اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور جو اس کے ارد گرد ہیں وہ پاکیزگی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر اور وہ بخشش مانگتے ہیں ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے (کہ) اے ہمارے رب! تو نے گھیر لیا ہے ہر چیز کو (اپنی) رحمت سے اور علم سے پس تو بخش دے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی اور پیروی کی تیرے راستے کی اور تو بچا ان کو دوزخ کے عذاب سے، اے ہمارے رب! اور تو داخل کر ان کو ہمیشہ رہنے والے باغوں میں وہ جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور جو نیک ہوئے ان کے باپ دادوں سے اور ان کی بیویوں سے اور ان کی اولاد میں سے بے شک تو ہی بڑا غالب خوب حکمت والا ہے اور تو بچا ان کو برائیوں سے اور

جس کو تو بچائے گا برائیوں سے اس دن تو تحقیق تو نے رحم کیا اس پر اور یہی ہے کامیابی بہت بڑی۔

③ اہلِ ایمان پر صلاۃ بھیجنا

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ فرشتے رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ بھیجتے ہیں: [إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ] [1] اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خبر بھی دی ہے کہ فرشتے مؤمنین پر بھی صلاۃ بھیجتے ہیں: [هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيماً] [2]

وہ ذات (اللہ تعالیٰ) تم پر صلاۃ بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تمہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جائے اور وہ (اللہ تعالیٰ) مؤمنین کے ساتھ خوب رحمت فرمانے والا ہے۔
واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کے مؤمنین پر صلاۃ بھیجنے سے مراد رحمتیں اتارنا اور برسانا ہے، جبکہ فرشتوں کے صلاۃ بھیجنے سے مراد مؤمنین کیلئے رحمت و بخشش کی دعا کرنا ہے۔

④ اہلِ ایمان کی دعاؤں پر آمین کہنا

عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال:(دعوة المرء مستجابة لأخيه بظهر الغيب،عند رأسه ملك يؤمن على دعائه،كلما دعا له بخير قال: آمين ولك بمثله) [3]

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آدمی کی اپنے بھائی کیلئے غائبانہ دعا قبول کر لی جاتی ہے، جب وہ غائبانہ دعا کر رہا ہوتا ہے تو اس کے سر کے پاس ایک فرشتہ اس دعا پر آمین کہتا ہے اور جب بھی وہ خیر کی دعا کرتا ہے فرشتہ کہتا ہے: آمین، اس دعا کا مثل تجھے بھی عطا ہو جائے۔

[1] الاحزاب:۵۶
[2] الاحزاب:۴۳
[3] صحیح ابن ماجہ ۲/۲۳۴۰

⑤ اہلِ ایمان کو بشارتیں دینا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝] [1]

ترجمہ: بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر جم گئے اترتے ہیں ان پر فرشتے یہ (کہتے ہوئے) کہ نہ تم خوف کرو اور نہ تم غم کھاؤ اور تم خوش ہو جاؤ جنت کے ساتھ وہ جس کا تم تھے وعدہ دیے جاتے ہم تمہارے دوست ہیں زندگانیٔ دنیا میں اور آخرت میں (بھی) اور تمہارے لئے ہے اس میں جو چاہیں گے تمہارے جی اور تمہارے لئے ہے اس میں جو تم مانگو گے۔
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے زید بن اسلم رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: فرشتے اہلِ ایمان کو موت کے وقت بشارت دیتے ہیں، نیز قبر میں بھی بشارت دیتے ہیں، پھر جب قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اس کٹھن لحمہ میں بھی بشارت دیں گے۔

⑥ علم اور ذکر کی مجالس میں حاضر ہونا

عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال قال النبی ﷺ :(إن الله تبارك وتعالى ملائكة يطوفون في الطرق يلتمسون أهل الذكر،فإذا وجدوا قوما يذكرون الله تعالى تنادوا: هلموا إلى حاجتكم،قال:فيحفونهم بأجنحتهم إلى السماء الدنيا) [2]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے راستوں میں گھومتے پھرتے اہلِ ذکر کو تلاش کرتے ہیں جب انہیں کوئی قوم اللہ کا ذکر کرتے ہوئے مل

[1] حم السجدة:۳۰۔۳۱
[2] متفق علیہ

جاتی ہے تو پکارتے ہیں: اپنی پسندیدہ حاجت کی طرف آجاؤ، پھر وہ فرشتے آسمانِ دنیا تک انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: (ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ یتلون کتاب اللہ ویتدارسونہ بینہم إلا نزلت علیہم السکینۃ وغشیتہم الرحمۃ وحفتہم الملائکۃ وذکرھم اللہ فیمن عندہ)[1]

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی بھی قوم اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں جمع ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں اس کا علم وفہم حاصل کرتی ہے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے اور انہیں رحمت ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے بھی اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان میں سے ہر شخص کا اپنے قریبی فرشتوں کے سامنے ذکر فرماتا ہے۔

⑦ رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں امت کا بھیجا ہوا سلام پہنچانا

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أن النبی ﷺ قال: (إن اللہ ملائکۃ سیاحین فی الأرض یبلغونی من أمتی السلام)[2]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے فرشتے پوری زمین میں پھیلے ہوئے ہیں اور مجھے میری امت کا بھیجا ہوا سلام پہنچاتے ہیں۔

⑧ جمعہ کی نماز کیلئے آنے والوں کے نام نوٹ کرنا

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: (اذا کان یوم الجمعۃ کان علی کل باب من أبواب المسجد ملائکۃ یکتبون الأول فالأول. فإذا جلس

---

[1] رواہ مسلم

[2] مسند أحمد، سنن نسائی، مستدرک حاکم، صحیح الجامع الصغیر ۲/۲۱۷

الإمام طووا الصحف وجاؤوا یستمعون الذکر)[1]

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے بیٹھ جاتے ہیں اور پہلے آنے والوں کے نام نوٹ کرتے ہیں، پھر جب امام خطبہ کیلئے منبر پر بیٹھ جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹرڈ لپیٹ دیتے ہیں اور خطبہ سننے کیلئے آجاتے ہیں۔

⑨ دن اور رات کی ڈیوٹیوں کیلئے زمین پر باری باری آنا

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: (یتعاقبون فیکم ملائکۃ باللیل وملائکۃ بالنہار ویجتمعون فی صلاۃ العصر وصلاۃ الفجر ثم یعرج الذین باتوا فیکم فیسألہم ربہم وھو أعلم بہم کیف ترکتم عبادی؟ فیقولون: ترکناھم وھم یصلون وأتیناھم وھم یصلون)[2]

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بیچ رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے باری باری آتے ہیں اور یہ فرشتے عصر کی نماز میں اور فجر کی نماز میں باہم اکٹھے ہوتے ہیں، پھر وہ فرشتے جنہوں نے تمہارے بیچ رات گذاری ہوتی ہے اپنی ڈیوٹی ختم کر کے آسمانوں کی طرف چڑھ جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان سے سوال کرتا ہے (حالانکہ وہ انہیں خوب جانتا ہوتا ہے) تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں: جب ہم انہیں چھوڑ کر آئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس گئے تو بھی نماز پڑھ رہے تھے۔

⑩ صالحین کی نماز جنازہ میں شریک ہونا

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا:

(ھذا الذی تحرک لہ العرش وفتحت لہ ابواب السماء وشھدہ سبعون ألفا

---

[1] رواہ البخاری

[2] متفق علیہ

من الملائكة. لقد ضم ضمة ثم فرج عنه) [1]

یعنی: یہ وہ شخصیت ہے جس کی وفات پر اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا اور آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے اور ستر ہزار فرشتوں نے اس کے جنازہ میں شرکت کی، (لیکن) اپنی قبر میں بھینچے گئے پھر کشادگی کر دی گئی۔

⑪ اہل ایمان کے ساتھ مل کر جنگ کرنا اور انہیں ثابت قدمی فراہم کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا:

[اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭسَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝۱۲] [2]

(یاد کرو) جب وحی کر رہا تھا آپ کا رب فرشتوں کی طرف کہ بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں لہٰذا تم ثابت (قدم) رکھو ان کو جو ایمان لائے عنقریب میں ڈال دوں گا ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے کفر کیا رعب لہٰذا تم مارو (ان کی) گردنوں پر اور تم ضرب لگاؤ ان کی (ہر) ہر پور پر۔

ملائکہ عملی طور پر اہل ایمان کے ساتھ ان کی لڑائیوں میں شریک ہوا کرتے تھے، جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲۳ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝۱۲۴ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝۱۲۵] [3]

---

[1] رواہ النسائی، صحیح الجامع الصغیر ۱۹۸۴/۲

[2] الانفال: ۱۲

[3] آل عمران: ۱۲۵-۱۲۳

اور البتہ تحقیق اللہ نے تمہاری مدد کی بدر میں جبکہ تم کمزور تھے چنانچہ تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر کرو جب آپ کہتے تھے مومنوں سے کیا ہرگز نہ کفایت کرے گی تمہیں یہ (بات) کہ مدد کرے تمہاری تمہارا رب ساتھ تین ہزار فرشتوں کے (جو) اتارے گئے ہیں (آسمان سے) کیوں نہیں (ہاں) اگر تم صبر کرو اور تم ڈرو اور وہ (دشمن) آجائے تمہارے پاس اسی دم ابھی (تو) مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب ساتھ پانچ ہزار فرشتوں کے (جو خاص) نشان والے ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے بدر والے دن فرمایا تھا:

(هذا جبريل آخذ برأس فرسه، عليه أداة الحرب) [1]

یعنی: یہ جبریل ہے، جو اپنے گھوڑے کا سر پکڑے ہوئے ہے اور جنگی لباس پہنے ہوئے ہے۔

⑫ فرشتوں کا شہداء پر اپنے پروں کا سایہ کرنا

عن جابر بن عبدالله قال لما قتل أبي جعلت أكشف الثوب عن وجهه وأبكي، وينهونني، والنبي ﷺ لا ينهاني. فجعلت عمتي فاطمة تبكي. فقال النبي ﷺ: (تبكين أو لا تبكين، ما زالت الملائكة تظله بأجنحتها حتى رفعتموه)

یعنی: جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: جب میرے والد شہید ہوئے تو میں ان کے چہرے سے بار بار کپڑا ہٹاتا اور روتا تھا، صحابہ کرام مجھے ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے جبکہ نبی ﷺ منع نہیں فرما رہے تھے، یہ دیکھ کر میری پھوپھی فاطمہ نے بھی رونا شروع کر دیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو روئے یا نہ روئے، فرشتے اس پر اپنے پروں کا سایہ ڈالے رہے، حتی کہ تم نے اسے اٹھالیا۔

⑬ طلبۃ العلم پر اپنے پروں کا سایہ کرنا

عن ابی الدرداء رضی الله عنه قال سمعت رسول الله ﷺ يقول من سلك

طریقا یطلب فیه علما سلك الله به طریقا من طرق الجنة وان الملائکة لتضع أجنحتها رضا لطالب العلم ...الحدیث[1]

یعنی: ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو شخص علم طلب کرنے کیلئے کسی راہ پر چلے، اللہ تعالیٰ اسے (درحقیقت) جنت کے راستے پر چلاتا ہے، اور بے شک فرشتے طالب علم کی محبت سے سرشار ہو کر اس پر اپنے پروں کا سایہ کرتے ہیں۔

⑭ بعض نیک بندوں کے ساتھ رات گذارنا اور ان کی ہر شر سے حفاظت کرنا اور ان کیلئے دعائیں کرتے رہنا

عن شداد بن أوس رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: (ما من مسلم یأخذ مضجعه یقرأ سورة من کتاب الله إلا وکل الله ملکا فلا یقربه شئ یؤذیه حتی یهب متی هب)[2]

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان اپنے بستر پر آئے اور قرآن پاک کی کوئی سورت پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے، چنانچہ اس کے بیدار ہونے تک کوئی موذی چیز اس کے قریب نہیں آسکے گی۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں اس شخص کیلئے جو باوضوء بستر پر آتا ہے، فرشتے کا اس کے ساتھ رات گذارنے کا ذکر ہے، جو رات بھر اس کیلئے رحمت اور مغفرت کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کے نتائج وثمرات

① چونکہ ملائکہ ایک غیبی مخلوق ہیں، جن کے موجود ہونے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے خبر دی ہے، لہذا غیب کی اس خبر پر ایمان لانے سے بندے کا ایمان مسلسل بڑھتا

[1] رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی
[2] رواہ الترمذی

رہے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰۗىِٕكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا][1]

یعنی: اور نہیں ہم نے بنائے نگران آگ کے مگر فرشتے ہی اور نہیں ہم نے بنائی (یہ) تعداد ان کی مگر آزمائش کیلئے ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تاکہ یقین کرلیں وہ لوگ جو دیے گئے کتاب اور زیادہ ہوں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ایمان میں......

② ایمان بالملائکۃ، اللہ تعالیٰ کے امتثال امر بہترین نمونہ ہے، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملائکہ پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے بلکہ اسے ایمان کا دوسرا رکن قرار دیا ہے، کما تقدم۔

③ ایمان بالملائکۃ، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم مخلوق کی معرفت کا موجب ہے نیز ملائکہ کے اعمال وصفات کی معرفت بھی اضافۂ علم کا باعث ہے۔

④ ملائکہ کی صفات کی معرفت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جن امور سے فرشتوں کو محبت ہے، ان امور کو اختیار کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بہت سے امور بیان ہوئے۔ نیز جن چیزوں سے فرشتوں کو نفرت وکراہت ہے، ان سے اجتناب برتنے کی توفیق ارزاں ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(من أکل الثوم والبصل والکراث فلا یقربن مسجدنا فإن الملائکة تتأذی مما یتأذی منه بنو آدم)[2]

یعنی: جس شخص نے کچا لہسن یا پیاز کھایا ہو وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے کیونکہ فرشتے ہر اس چیز سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جس سے اولاد آدم تکلیف محسوس کرتی ہے۔

[1] المدثر: ۳۱
[2] متفق علیہ

⑤ فرشتوں کا اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور اس کی مستقل اطاعت کرتے رہنا اور کبھی نافرمانی نہ کرنا، ہم انسانوں کیلئے بہت بڑی نصیحت ہے، ایک انتہائی عظیم اور قوی مخلوق کے خوف واطاعت کا یہ عالم ہے تو ہمیں کس قدر اپنے رب کا خوف اور اطاعت اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔

⑥ وہ حقیقی مؤمن جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے میدان میں موجود ہے، اس کیلئے انتہائی صبر واستقامت اور ثبات واستقلال کا پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس میدان میں اس کے ہم رکاب ہیں، اور جہادی مہم میں شانہ بشانہ شریک ہیں۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

ایمان کا تیسرا رکن: ایمان بالکتب

کتب، کتاب کی جمع ہے، اور کتاب بمعنی مکتوب ہے، کتاب کو کتاب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں احکام ومسائل وغیرہ مکتوب یعنی لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔

حدیث میں جن کتب پر ایمان لانے کا ذکر ہے، ان سے مراد وہ کتب ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل فرمائیں، قرآن پاک سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی پر کتاب اتاری ہے، چنانچہ فرمایا:

[كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ][1]

یعنی: لوگ ایک جماعت تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری۔

ابراہیم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا ہے:

[وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ][2]

یعنی: اور ہم نے ان کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھی۔

کتب سابقہ پر ایمان لانے کا طریقہ

تمام کتب سابقہ پر ایمان لانا اور ان کے سچا ہونے کی تصدیق کرنا فرض ہے، اور یہ کہ وہ سب منزل من اللہ ہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں، اور مخلوق نہیں ہیں۔

---

[1] البقرة:٣١٢

[2] الحديد:٢٦

کتب سابقہ کے نام

جن کتب کے قرآن مجید میں نام مذکور ہیں ان پر ان ناموں کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے، مثلاً: تورات، انجیل، زبور، صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ علیہ السلام۔

ان کے علاوہ میرے ناقص علم کے مطابق کسی کتاب کا نام نہیں ملتا، لیکن ہر کتاب پر ایمان لانا فرض ہے، خواہ نام مذکور نہ بھی ہو۔

قرآن پاک میں سب سے زیادہ ذکر تورات کا ملتا ہے، اسی طرح انبیاء میں سے صاحب تورات یعنی موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ ذکر موجود ہے۔

تورات کا الکتاب، الفرقان، الضیاء اور الذکر کے نام سے بھی تذکرہ وارد ہے۔

سابقہ کتب سماویہ کے مخاطب بھی انسان تھے، ان کا نزول انسانوں کی ہدایت کیلئے ہوا، ان کی پیروی موجب رضوان واجر وثواب تھی، جبکہ مخالفت اور بدعملی باعث خسران وگناہ وعقاب تھی۔

اس سلسلہ وحیٔ الٰہی کی آخری کڑی، اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم کے نزول کی صورت میں ہے، جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے تشریح وتفسیر کے ساتھ نازل فرمایا، چنانچہ ارشاد ہے:

[لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿١٦﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿١٩﴾][1]

یعنی: اے محمد (ﷺ) آپ (قرآن کے نزول کے وقت) اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ جلدی سے اس وحی کو اخذ کرلیں، بے شک اس کا آپ کے سینے میں جمع کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھوانا ہماری ذمہ داری ہے، پس جب ہم پڑھ چکیں تو آپ پڑھئے، پھر اس کا بیان بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

[1] القیامۃ:۱۹-۱۶

یہ بیان وتفسیر، حدیث رسول ﷺ کے نام سے موسوم ہے، جسے الگ سے نازل کرکے امت کو درحقیقت، رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے تعلق سے ایک کڑی آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے، چنانچہ اس دین کی اتباع میں سچا وہی ہے جو صحیح معنی میں متبع رسول ہو، اور متبع رسول ہونے کیلئے آپ ﷺ کی حدیث کی پیروی ضروری ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو ہوسکے، قال اللہ تعالیٰ:

[وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ][1]

فافهموا هذا المقام فإنه مهم جدا.

قرآن پاک اور کتب سابقہ میں فرق

بہت سے فرق ہیں، ہم ذیل میں بالاختصار پانچ فروق کا ذکر کرتے ہیں:

① سابقہ کتب پر ایمان لانا اجمالاً ہے، جبکہ قرآن پاک پر تفصیلاً ایمان لانا فرض ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے تمام اوامر ونواہی کو قبول کرتے ہوئے ہر امر کو لازماً اپنایا جائے اور ہر نہی سے لازماً اجتناب کیا جائے، نیز یہ کہ اس کی تمام خبروں پر ایمان لایا جائے، خواہ ان کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو جیسے انبیاء سابقین علیہم السلام کے واقعات، اور خواہ زمانہ مستقبل سے ہو جیسے قیامت کے احوال وغیرہ، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت قرآن مجید کے بیان کی بنیاد پر ہو، جس کی تشریح وتوضیح کا دارومدار، سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

② قرآن مجید ایک معجزہ خالدہ ہے، جو تاقیام قیامت، رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی صداقت وحقانیت کی دلیل اتم ہے، یہ وہ فصیح وبلیغ کتاب ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے موجود تمام ادباء، فصحاء، بلغاء اور شعراء کو چیلنج کیا تھا، اور یہ چیلنج قیامت تک کیلئے قائم ومستمر

[1] البقرۃ:۱۴۳

ہے،فرمایا:

[قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝۸۸] [1]

یعنی: کہہ دیجئے اگر تمام جن وانس اس بات پر اکٹھے ہوں کہ اس قرآن کا مثل بنائیں، تو وہ اس کا مثل نہیں بنا سکتے، خواہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

بلکہ صرف دس سورتوں کا مثل لانے کا چیلنج بھی موجود ہے، بلکہ ایک سورت، بلکہ ایک آیت کے مثل کا چیلنج بھی مذکور ہے۔

اس وقت کے کفار کو اپنی انشاء پردازی پر بڑا ناز تھا، مگر وہ باوجود کوشش بسیار، اس چیلنج کی تکمیل میں بری طرح ناکام ہوگئے۔

یہ چیلنج مستقل موجود ہے، جس کی تکمیل آج تک کوئی نہ کرسکا اور نہ قیامت تک کوئی کرسکے گا، یوں قرآن پاک رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے احقاق واثبات کیلئے ایک معجزۂ خالدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

③ سابقہ کتبِ سماویہ، ملحدین کی سازشوں کی وجہ سے بری طرح تحریف وتبدیل کا شکار ہوئیں؛ کیونکہ اللہ تعالی نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا تھا، چنانچہ ان کتب کے متبعین و مکلفین بری طرح ناکام ہوگئے، جبکہ قرآن پاک اس تبدیل وتحریف سے بالکل محفوظ ہے، نہ تو زمانہ نزول میں کوئی تحریف کرسکا، نہ آج تک اتنی صدیاں گذرنے کے باوجود کوئی تحریف کرسکا اور نہ قیامت تک کوئی تحریف کرسکے گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اس کتاب مقدس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے، فرمایا:

[اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹] [1]

یعنی: ہم نے ہی اس ذکر (کتاب وسنت) کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

واضح ہو کہ اگر کسی نے کسی قسم کی تحریف کی مذموم کوشش کی بھی تو اس امت کے جہابذہ نے اسے بے نقاب کرکے، اس سازش کو ناکام بنا دیا، گویا قرآن وحدیث کا محافظ خود اللہ رب العزت ہے اور اس نے حفاظت کا یہ شرف اپنے ان بندوں کو سونپ دیا جو قرآن وحدیث کے لفظی ومعنوی حافظ ہیں، یہ اس زمین کی پشت پر اللہ تعالی کے دین کے حفاظت کیلئے اللہ تعالی کے سپاہی ہیں۔ فرحمھم اللہ وزادھم شرفا۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

[اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ۝۴۱ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۝۴۲] [2]

یعنی: بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا قرآن کے ساتھ، جب وہ آیا ان کے پاس (تو وہ ہلاک ہوگئے) اور بے شک وہ البتہ ایک کتاب ہے بلند مرتبہ، نہیں آسکتا اس کے پاس باطل اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے (وہ) نازل کردہ ہے بڑے حکمت والے قابل تعریف کی طرف سے۔

④ ایک فرق یہ بھی ہے کہ کتبِ سابقہ کا نزول جملۃً واحدۃً ہوگیا، لیکن قرآن پاک کا نزول، آہستہ آہستہ حسب ضرورت ہوا، جس کے بہت سے مقاصد ہیں، ایک اہم مقصد رسول اللہ ﷺ کی تثبیت قلبی ہے، دوسرا مقصد امت کیلئے آسانی مہیا کرنا ہے، ایک اور مقصد یہ بھی ہے کہ جس طرح قرآن مجید آہستہ آہستہ نازل ہوا اسی طرح اسے پڑھنے والے خوب سوچ سمجھ کر ترتیل کے ساتھ پڑھیں، آیت ذیل میں انہی بعض مقاصد کی طرف اشارہ ہے۔

[1] الحجر: ۹
[2] حم السجدۃ: ۴۲،۴۱

[وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾][1]

یعنی: اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا کیوں نہیں اتارا گیا اس پر (یہ) قرآن اکٹھا ایک ہی بار؟ اسی طرح (ہم نے اتارا) تاکہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ذریعے سے آپ کا دل اور ہم نے پڑھا اسے تھوڑا تھوڑا کرکے پڑھنا۔

⑤ قرآنِ مجید کو سابقہ تمام کتب کیلئے "مھیمن" قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ][2]

یعنی: اور ہم نے اتاری آپ کی طرف کتاب جو حق کے ساتھ ہے تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے کی تمام کتب کی اور ان پر مھیمن ہے، پس آپ ان کے درمیان فیصلہ کیجئے اس چیز کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے (مھیمن) کا معنی (امین) منقول ہے، یعنی قرآن پاک سابقہ تمام کتب پر امین ہے۔ ابن جریر (امین) ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: قرآن پاک کتبِ سابقہ پر امین ہے، چنانچہ قرآن پاک، کتبِ سابقہ کی جس خبر کی موافقت کرے وہ حق ہے اور جس کی مخالفت کرے وہ باطل ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے (مھیمن) بمعنی (شہید) بھی منقول ہے، جبکہ انہی سے اس کی تیسری تفسیر یہ بھی ثابت ہے کہ قرآن مجید سابقہ تمام کتب پر حاکم ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ تینوں تفسیریں قریب المعنی ہیں، اور لفظ مھیمن ان تینوں

[1] الفرقان: ۳۲
[2] المائدة: ۴۸

معانی کو جامع ہے، چنانچہ قرآن پاک کتب سابقہ پر امین بھی ہے اور شاہد اور حاکم بھی، اللہ تعالیٰ نے اس کتابِ عظیم کو اپنی آخری وحی کے طور پر نازل فرمایا اور اسے تمام کتب سے اکمل، اعظم اور اشمل قرار دیا، اس میں کتبِ سابقہ کے محاسن ودیعت کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے کمالات کا اضافہ فرمایا۔

قرآنِ پاک کے بارہ میں اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ

واضح ہو کہ قرآنِ پاک، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے آحادِ کلام میں سے ہے، اللہ تعالیٰ کلام فرماتا ہے اور متکلم بالصوت ہونا اس کی صفاتِ اختیاریہ میں شامل ہے، وہ جب چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے کلام فرماتا ہے، اس کا کلام لفظی ہے، یعنی حروف والفاظ کے ساتھ کلام فرماتا ہے، وہ کلام لکھا جاتا ہے اور جب وہ کلام فرماتا ہے اور جس سے فرماتا ہے وہ اسے سنتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کا کلام مکتوب ومسموع ہے، اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا جو انہوں نے سنا [وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾][1] اس نے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں سے کلام فرمایا جو انہوں نے سنا بھی اور اس کا جواب بھی دیا، وہ قیامت کے دن تمام انسانوں سے حساب لے گا اور کلام فرمائے گا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(مامنکم من أحد إلا سیکلمه ربه ولیس بینه وبینه ترجمان)[2]

یعنی: تم سب سے تمہارے پروردگار نے کلام فرمانا ہے، اس طرح کہ اس کے اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا۔

فرقہ اشاعرہ اور ماتریدیہ، جن کی ترجمانی احناف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی صفت کلام میں من مانی تاویل کرتا ہے، ان کے نزدیک کلام اللہ سے مراد کلام نفسی ہے، یہ ایک محدث اصطلاح ہے،

[1] النساء: ۱۶۴
[2] صحیح بخاری، الرقم: ۷۴۴۳

جو سلف صالحین سے منقول نہیں ہے، اور ایک ایسی تاویل ہے جو قطعاً اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہے، ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت صفت کلام سے متصف ہے، جس کی کیفیت معلوم نہیں ہے، اور چونکہ اس کی ہر صفت کمال کی ہے لہذا اس کا کلام فرمانا بھی ایسا کمال کا ہے جو ہر نقص وعیب سے پاک ہے۔

مزید تفصیل کیلئے امام مقدسی رحمہ اللہ کی کتاب "لمعة الاعتقاد" سے چند اہم امور نقل کئے جاتے ہیں، یہ مسائل شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کی شرح کے ساتھ مزید نکھر کر سامنے آئیں گے، وہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے کلام میں قرآن عظیم بھی شامل ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی واضح کتاب اور مضبوط رسی ہے، نیز صراطِ مستقیم ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے وقفہ وقفہ سے نازل ہوا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے جبرائیل آمین کے ذریعے واضح عربی لغت میں سید المرسلین (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب اطہر پر نازل کیا، قرآن منزل من اللہ ہے، مخلوق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور اس کی طرف لوٹ جائیگا۔

قرآن محکم سورتوں، آیاتِ بینات اور حروف وکلمات پر مشتمل ہے جس نے صحیح تلفظ سے قرآن پڑھا اسے ہر لفظ کے بدلے دس نیکیاں ملیں گی، قرآن پاک کا اول بھی ہے اور آخر بھی، اور یہ اجزاء وابعاض پر مشتمل ہے، زبانوں پر تلاوت اور سینوں میں محفوظ کیا جاتا ہے، یہ محکمات ومتشابھات، ناسخ ومنسوخ، خاص وعام اور امر ونہی پر مشتمل ہے:

[لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾][1]

ترجمہ: جس کے پاس باطل بھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ حکمتوں والے خوبیوں والے (اللہ) کی طرف سے نازل کردہ ہے)

[1] فصلت:٤٢

وقولہ تعالیٰ: [قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴿٨٨﴾][1]

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

قرآن کے متعلق عقیدہ

قرآنِ کریم کلام اللہ میں سے ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے، مخلوق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے اور اسی کی طرف لوٹ جائیگا۔ یہ قرآن حروف ومعانی سمیت کلام اللہ ہے۔

قرآن کے کلام اللہ میں سے ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ][2]

ترجمہ: اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو تو اسے پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔

مذکورہ آیت میں کلام اللہ سے مراد قرآن ہے۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ][3]

ترجمہ: بہت بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس نے اپنے بندہ پر فرقان اتارا۔

قرآن کے غیر مخلوق ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ][4]

[2] التوبة:٦
[3] الفرقان:١
[4] الاعراف:٥٤

ترجمہ: یاد رکھو! اللہ ہی کیلئے ہے خلق اور امر۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "الأمر" کو خلق کا غیر قرار دیا ہے، جبکہ قرآن الأمر میں سے ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا][1]

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے امر سے روح کو اتارا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ][2]

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کا امر ہے جو اس نے تمہاری طرف اتارا۔

اور قرآن اس لیئے بھی غیر مخلوق ہے کہ قرآن کلام اللہ میں سے ہے، اور کلام اللہ، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات غیر مخلوق ہیں، لہذا قرآن غیر مخلوق ہے۔

قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے اور کلام کی نسبت اسی کی طرف کی جاتی ہے جس نے اولاًوہ کلام کی ہو۔

اور قرآن کے اللہ تعالیٰ کی طرف واپس لوٹ جانے کی دلیل یہ ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن مجید صحائف اور لوگوں کے سینوں سے اٹھالیا جائے گا۔[3]

اور یہ وہ کتابِ عربی ہے جس کے متعلق کفار نے کہا تھا:

[لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ][4]

---

[1] الشوریٰ: ۵۲

[2] الطلاق: ۵

[3] یہ حدیث رسول اللہ سے صحیح ثابت ہے۔ چنانچہ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی مرفوعاً حدیث ہے: [...لیسری علی کتاب اللہ عزوجل فی لیلة فلایبقی فی الأرض منه آیة...] الخ ترجمہ: کتاب اللہ پر کوئی رات ایسی آئے گی کہ زمین پر کوئی ایک آیت بھی باقی نہیں رہے گی۔ اس روایت کو ابن ماجہ (۴۰۴۹) اور حاکم (۴ / ۴۷۳) نے روایت کیا ہے۔ حاکم فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے اور شرطِ مسلم پر ہے، الذھبی نے موافقت کی ہے۔ شیخ البانی نے بھی الصحیحۃ (۸۷) میں ان دونوں کی تائید کی ہے، یہ روایت ابوھریرۃ اور ابن مسعود سے موقوفاً صحیح ثابت ہے۔ دیکھیئے: العقیدہ السلفیۃ فی کلام رب البریۃ (ص: ۱۷۳، ۱۷۴)

[4] سبأ: ۳۱

ترجمہ: اور کافروں نے کہا: ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے۔

اور بعض نے کہا:

[اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵][1]

ترجمہ: نہیں ہے یہ مگر انسانی کلام۔

تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

[سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝۲۶][2]

ترجمہ: میں عنقریب اسے دوزخ میں ڈالونگا۔

اور بعض نے کہا یہ تو شعر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

[وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝۶۹][3]

ترجمہ: نہ تو ہم نے اس پیغمبر کو شعر سکھائے اور نہ یہ اس کے لائق ہے وہ تو صرف نصیحت اور واضح قرآن ہے۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے شعر ہونے کی نفی فرمادی اور اس کا قرآن ہونا ثابت فرمادیا تو اب کسی صاحب عقل کیلئے کسی شبہ کی قطعی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن پاک ہی وہ عربی کتاب ہے جو کلمات، حروف اور آیات پر مشتمل ہے، کیونکہ اگر یہ قرآن کلمات وحروف پر مشتمل نہ ہوتا تو کوئی بھی اسے شعر نہ کہتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠

---

[1] المدثر: ۲۵

وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَ كُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ] [1]

ترجمہ: ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو۔

قرآن ایک معلوم اور متعارف چیز تھی تب ہی تو اس جیسی چیز لانے کا کفار کو چیلنج دیا گیا، اگر یہ غیر معروف اور عقل وفہم میں نہ آنے والی کوئی چیز ہوتی تو اس جیسی چیز لانے کا چیلنج دینا چہ معنی دارد؟!!

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَآ اَوۡ بَدِّلۡهُ ؕ قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآىِٕ نَفۡسِىۡ ۚ] [2]

ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں، جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے۔ آپ یوں کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ قرآن ہی وہ آیاتِ بینات ہے جن کی کفار پر تلاوت ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِىۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ] [3]

ترجمہ: بلکہ یہ قرآن تو روشن واضح آیات ہیں، جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

اسی طرح قسم کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] البقرۃ: ۲۳

[اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِيۡمٌۙ‏ فِىۡ كِتٰبٍ مَّكۡنُوۡنٍۙ‏ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الۡمُطَهَّرُوۡنَؕ‏] [1]

ترجمہ: بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے۔ جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔ جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[كهيعص] [2]

[حم. عسق] [3]

اس طرح انتیس سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے فرمایا۔

نبی ﷺ کا فرمان ہے: (جس نے بغیر غلطی کیلئے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھا اس کے لیئے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں، اور جس نے غلطی کی اس کیلئے ہر حرف کے بدلے صرف ایک نیکی ہے) [4]

---

[2] مریم: ۱

[3] الشوری: ۱

[4] یہ حدیث شدید ضعیف ہے۔ اسے طبرانی نے اوسط میں (مجمع الزوائد: ۷ / ۱۶۳) ابن مسعود سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: [قال رسول الله ﷺ :اعربوا القرآن فان من قرأ قرآن فاعربه، فله عشر حسنات، و كفارة عشر سيئات ورفع عشر درجات] ترجمہ: [رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھا اس کیلئے دس نیکیاں ہیں اور اس کے دس گناہوں کا کفارہ ہے اور دس درجات کی بلندی ہے] امام ہیثمی فرماتے ہیں: "سند میں نہشل راوی متروک ہے" اسحق بن راھویہ نے بھی اسے کذاب کہا ہے۔ ابن قدامۃ نے البرھان میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ شدید ضعیف ہے۔ عبد اللہ بن مسعود سے ایک اور حدیث بھی آئی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: [من قرأ حرفا فی كتاب الله ...الخ] ترجمہ: [جو شخص کتاب اللہ سے ایک حرف پڑھتا ہے اسے ایک نیکی ملتی ہے اور ایک نیکی پر دس گناہ اجر ملتا ہے، اور میں یہ نہیں کہتا کہ "الٓمٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف الگ حرف ہے، لام الگ حرف ہے اور میم الگ حرف ہے] اس روایت کو امام ترمذی (۲۹۰) نے مرفوعاً روایت کیا ہے، لیکن ہمارے فاضل بھائی عبد اللہ بن یوسف نے اس کے موقوف ہونے کو راجح قرار دیا ہے)

آپ ﷺ کا فرمان ہے: (خوب قرآن پڑھو! کیونکہ ایسے لوگ آنے والے ہیں جو اس کے حروف کو اس طرح سیدھا کریں گے جس طرح تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے، لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ فوری اجرت کے طلبگار ہونگے، (آخرت کے ثواب کیلئے انتظار نہیں کریں گے)[1]

ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے: قرآن کو صحیح اور درست پڑھنا ہمیں اس کے حروف کے حفظ سے زیادہ پسند ہے۔[2]

جناب علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے جس نے قرآن مجید کے ایک حرف کا انکار کیا گویا اس نے پورے قرآن کا انکار کیا۔[3]

---

[1] یہ حدیث صحیح ہے۔احمد (۵/۳۳۸) ابوداؤد (۸۳۱) ابن حبان (۱۸۷۶---موارد) اسکی سند میں ضعف ہے البتہ اس حدیث کے شواہد ہیں جس سے یہ حدیث قوی ہوگئی ہے۔ایک شاہد جابر بن عبداللہ کی حدیث، احمد (۳/۳۹۷) ابوداؤد (۸۳۰) میں ہے، اور اس کی سند صحیح ہے۔دیکھیئے الصحیحہ: (۲۵۹)

[2] یہ اثر شدید ضعیف ہے۔اس اثر کو ابن الأنباری نے الوقف والابتداء (۱/۲۰) میں ان الفاظ کیساتھ روایت کیا ہے۔ البعض اعراب القرآنِ اعجب الینا من حفظ بعض حروفه ترجمہ: [قرآن کو صحیح تلفظ سے پڑھنا ہمیں اسکے حفظ سے زیادہ پسند ہے۔] البتہ اس کی سند شدید ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں جابر بن یزید الجعفی ہے جو کہ ضعیف ہے اور شریک القاضی ہے جو صدوق ہے اور بہت غلطیاں کرتا ہے اور اس کا حفظ بھی خراب ہوگیا تھا۔اور سند میں انقطاع بھی ہے۔ (تعلیق بدر البدر علی اللمعۃ: ۱۹) ابن قدامۃ نے اس اثر کو البرہان (۴۴) میں ذکر کیا ہے)

[3] اس اثر کو ابن ابی شیبہ نے (۱۰/۵۱۳، ۵۱۴) اور ابن جریر نے اپنی تفسیر (۵۶) میں شعیب بن الحبحاب کے طریق سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: کہ ابو العالیۃ کے پاس جب کوئی شخص قرآن پڑھتا تو وہ یہ نہ کہتے کہ اس نے غلط پڑھا ہے، بلکہ کہتے: میں اس لفظ کو یوں پڑھتا ہوں۔شعیب بن الحبحاب کہتے ہیں میں نے یہ بات ابراھیم نخعی سے کہی تو انہوں نے کہا: کہ میرا خیال ہے کہ آپ کے ساتھی (یعنی ابو العالیۃ) نے یہ بات سن رکھی ہے "جس نے قرآن کے ایک حرف کا انکار کیا اس نے پورے قرآن کا انکار کیا" اس کی سند صحیح ہے۔ابن قدامۃ نے اس اثر کو البرھان (ص: ۴۵) میں ذکر کیا ہے، اور علی رضی اللہ عنہ سے ایک اور اثر بھی ذکر کیا ہے کہ ان سے جنبی آدمی کے متعلق سوال کیا گیا کیا وہ قرآن پڑھ سکتا ہے؟ تو انہوں نے کہا: نہیں، ایک حرف بھی نہیں۔)

میں کہتا ہوں علی رضی اللہ عنہ کا یہ اثر مصنف ابن ابی شیبہ (۱/۱۰۲) میں بھی ہے۔

مسلمانوں کا قرآن کی سورتوں، آیتوں، کلمات اور حروف کی تعداد پر اتفاق ہے۔

ایسے شخص کے کفر میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں جو قرآن کی کسی ایک صورت یا آیت یا کلمہ یا حرف جس کا قرآن میں سے ہونا متفق علیہ ہو، کا انکار کرے۔

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ قرآن حروف پر مشتمل کتاب ہے۔[1]

قرآن حروف وکلمات ہے

قرآن مجید کے حروف وکلمات ہونے پر مؤلف رحمہ اللہ نے آٹھ دلائل بیان کیئے ہیں۔

(مؤلف رحمہ اللہ کا قرآنِ حکیم کے حروف پر مشتمل ہونے کو ثابت کرنا درحقیقت فرقہ اشاعرہ پر رد ہے، جو قرآنِ حکیم کے حروف مقروءہ کو مخلوق قرار دیتے ہیں اور ان حروف کو کلام اللہ کی تعبیر سمجھتے ہیں اور کلام اللہ سے مراد بقول ان کے وہ معنی ہے جو قائم بذات اللہ ہے، چنانچہ ان کے رد کیلئے وہ آٹھ دلائل ملاحظہ ہوں)

① کفار نے قرآن مجید کو شعر قرار دیا ہے۔اور شعر کا اطلاق حروف وکلمات پر مشتمل کلام ہی پر کیا جاسکتا ہے۔(لہذا معلوم ہوا کہ قرآن حروف وکلمات پر مشتمل کلام ہے۔)

② اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی تکذیب کرنے والوں کو چیلنج دیا ہے کہ اس جیسا کلام پیش کرو، اگر قرآن حروف وکلمات پر مشتمل کلام نہیں تو چیلنج بالکل باطل ہے، کیونکہ چیلنج معلوم ومعقول چیز کے متعلق ہوتا ہے نا کہ غیر معلوم وغیر معقول چیز کے متعلق۔

---

[1] ابن قدامۃ البرحان (۲۷) میں فرماتے ہیں یہ بات معلوم ہے کہ مشرکین نے الفاظِ قرآن مراد لیے ہیں اس لیئے کہ شعر، کلامِ موزون کو کہتے ہیں، لہذا معنی کو شعر نہیں کہا جاسکتا، اور نہ ہی اس چیز کو شعر کہا جاسکتا ہے جو کلام نہ ہو۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ذکر اور قرآنِ مبین کہا ہے۔قرآن کے حروف اور کلمات پر مشتمل ہونے کے کتاب وسنت اور اجماع کے دلائل کیلئے "برحان فی بیان القرآن" لابن قدامۃ: (ص: ۲۶: ۸۳) کا مطالعہ کریں۔

③[وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ] [1]

ترجمہ: اور جب ان کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں، جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کی امید نہیں ہے یوں کہتے ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے آپ یوں کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حق نہیں کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں۔

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ قرآن، کفار پر تلاوت کیا جاتا تھا۔ جبکہ یہ بات مسلم ہے کہ تلاوت حروف وکلمات پر مشتمل کلام کی ہی ممکن ہے۔

④[بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ] [2]

ترجمہ: بلکہ یہ قرآن تو روشن واضح آیات ہیں، جو اہل علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

[اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝] [3]

ترجمہ: بے شک یہ قرآن بہت بڑی عزت والا ہے۔ جو ایک محفوظ کتاب میں درج ہے۔ جسے صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

مذکورہ دونوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید کے متعلق خبر دی ہے کی وہ اہل علم کے سینوں میں محفوظ اور لوحِ محفوظ میں مکتوب ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح اور ظاہر ہے کہ حفظ اور کتابت، حروف وکلمات پر مشتمل کلام ہی کی ممکن ہے۔

⑤رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(من قرأ القرآن فأعربه. فله بكل حرف منه عشر حسنات، ومن قرأه ولحن

[1] یونس: ۱۵
[2] العنکبوت: ۴۹
[3] الواقعۃ: ۷۷-۷۹

فيه فله بكل حرف حسنة) (حدیث صحیح) [1]

ترجمہ: نبی ﷺ کا فرمان ہے: جس نے بغیر غلطی کیئے صحیح تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھا اس کے لیئے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں ہیں، اور جس نے غلطی کی اس کیلئے ہر حرف کے بدلے صرف ایک نیکی ہے۔

(مؤلف رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے لیکن کسی کتاب کی طرف اس کی نسبت نہیں کی، مجھے بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ اس حدیث کو کس نے روایت کیا ہے۔ شارح)

⑥ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کا قول:

"قرآن کو صحیح اور درست پڑھنا ہمیں اس کے حروف کے حفظ سے زیادہ پسند ہے"

⑦علی رضی اللہ عنہ کا قول

"جس نے قرآن مجید کے ایک حرف کا انکار کیا گویا اس نے پورے قرآن کا انکار کیا۔"

⑧ قرآن کی کسی ایک سورت، آیت، کلمہ اور حرف کے منکر کے کفر پر مسلمانوں کا اجماع۔ [2] اسی طرح قرآن کی سورتوں کی تعداد (۱۱۴) ہے جن میں سے (۲۹) کی ابتداء حروفِ مقطعات سے ہوئی ہے، پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ (سلف صالحین سے نقل کردہ مذکورہ اقوال میں بصراحت یہ بات موجود ہے کہ قرآن حکیم حروف پر مشتمل ہے)

اوصافِ قرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بہت سے عظیم اوصاف بیان فرمائے ہیں، ان میں سے مؤلف رحمہ اللہ نے درج ذیل اوصاف بیان کیئے ہیں۔

① "کتاب اللہ المبین" یعنی احکام واخبار کو انتہائی وضاحت وصراحت سے بیان

[1] پیچھے گزر چکا ہے کہ یہ حدیث غیر صحیح اور شدید ضعیف ہے۔ ہیثمی نے اس کی نسبت طبرانی اوسط کی طرف کی ہے۔
[2] البرهان لابن قدامة (۴۹: ۵۱) کا مطالعہ کریں۔ ابن قدامۃ نے اس مسئلہ اور اس کے متعلق دیگر امور پر اجماع ذکر کیا ہے۔

کرنیوالی کتاب۔

② "حبل اللہ المتین"۔ (اللہ کی مضبوط رسی)

یعنی قرآن ایک مضبوط اور قوی سہارا ہے جسے تھام کر اللہ تعالی تک رسائی اور اخروی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

③ "سور محکمات"۔ (محکم سورتیں) یعنی قرآن متعدد سورتوں پر مشتمل ہے، اس طرح کہ ہر سورت دوسری سے جدا ہے اور یہ سورتیں اپنے معانی ومطالب میں بالکل واضح ہیں اور تناقضات ونقائص سے پاک ہیں۔

④ "آیاتِ بینات"۔ (واضح دلائل) یعنی قرآن اللہ تعالی کی توحید، کمالِ صفات اور اس کی شریعت کی عمدگی پر واضح دلائل پر مشتمل کتاب ہے۔

⑤ قرآن میں محکم ومتشابہ دونوں قسم کی آیات ہیں۔ محکم ان آیات کو کہتے ہیں جن کا معنی واضح ہو، اور متشابہ ان آیات کو جن کا معنی ومفہوم واضح نہ ہو۔

محکم ومتشابہ کا یہ معنی ایک دوسرے کے مقابل ہونے کی وجہ سے ہے، وگرنہ تناقضات سے پاک ہونے کے معنی میں تو متشابہ بھی محکم ہے، اس اعتبار سے تو پورا قرآن ہی محکم ہے۔

⑥ قرآن کتابِ حق ہے باطل کسی بھی جہت سے اس کی طرف راہ نہیں پاسکتا:

[لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝۴۲] [1]

ترجمہ: جس کے پاس باطل بھٹک بھی نہیں سکتا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ حکمتوں والے خوبیوں والے (اللہ) کی طرف سے نازل کردہ کتاب ہے۔

⑦ قرآن شعر نہیں، جیسا کہ اس کی تکذیب کرنیوالوں (کفار) نے اس پر شعر ہونے کا افتراء

[1] فصلت: ۴۲

باندھا ہے۔:

[وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِیْنٌ ۝۶۹] [1]

ترجمہ: نہ تو ہم نے اس پیغمبر کو شعر سکھائے اور نہ یہ اس کے لائق ہے وہ تو صرف نصیحت اور واضح قرآن ہے۔

اسی طرح قرآن جادو بھی نہیں ہے جیسا کہ بعض مکذبین نے اس پر جادو ہونے کا افتراء باندھا ہے:

[فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ ۝۲۴ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝۲۵] [2]

ترجمہ: اور کہنے لگے یہ تو صرف جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے، سوائے انسانی کلام کے کچھ بھی نہیں) اللہ تعالی نے انہیں دھمکاتے ہوئے فرمایا:

[سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ۝۲۶] [3]

ترجمہ: میں عنقریب اسے دوزخ میں ڈالونگا۔

⑧ قرآن کتاب معجز ہے، کوئی بھی انسان اس جیسا کلام پیش نہیں کرسکتا، خواہ وہ اپنے تمام معاونین کے ساتھ مل جائے:

[قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ۝۸۸] [4]

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور کل جنات مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ناممکن ہے گو وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

[1] یس: ۶۹
[2] المدثر: ۲۴، ۲۵
[3] المدثر: ۲۶
[4] بنی اسرائیل: ۸۸

ایمان کا چوتھا رکن: ایمان بالرسل

ایمان کا چوتھا رکن، ایمان بالرسل ہے۔

یعنی اس بات کا اقرار اور دل سے تصدیق کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے انبیاء ورسل علیہم السلام کو چنا اور انہیں انسانوں کی ہدایت کیلئے، ان کی طرف مبعوث فرمادیا، تاکہ ظلمات میں بھٹکتی انسانیت کو اندھیروں سے نکال کر، نورِ حق کی طرف منتقل کردیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ] [1]

یعنی: اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسولوں کو چنتا ہے۔

جنوں میں سے رسول نہیں چنے گئے، جنوں میں نذر (نذیر کی جمع) ہوتے ہیں، جو وقت کے نبی کی شریعت کو لیکر ان کے اندر دعوت کا کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝] [2]

---

[1] الحج: ۷۵

[2] الاحقاف: ۳۰،۲۹

یعنی: اور جب ہم نے پھیرا آپ کی طرف جنوں کی ایک جماعت کو، سنتے تھے قرآن پاک کو، جب سب وہاں آموجود ہوئے تو انہوں نے کہا: خاموشی اختیار کرو جب قرآن کی تلاوت ختم ہوئی تو وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے ڈرانے والے، انہوں نے کہا اے قوم! ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہے، وہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے سابقہ کتب کی اور وہ حق اور طریق مستقیم کی طرف ہدایت دیتی ہے۔

انبیاء ورسل انسانوں میں سے تھے جنوں میں سے نہیں

ان آیات میں جنوں میں سے رسولوں کا نہیں بلکہ منذرین کا ذکر کیا گیا ہے، اور ان منذرین نے اپنے کسی نبی کا ذکر نہیں کیا، بلکہ محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا ہے، نیز اپنی کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا بلکہ تورات اور قرآن کا ذکر کیا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جنوں نے تورات کے بعد نازل ہونے والی کتاب انجیل کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے رسول عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام حلال وحرام میں تورات ہی کے احکام کے پابند تھے اور انہی احکام کو اپنی امت تک پہنچانے کے مکلف تھے، ان کی کتاب انجیل زیادہ تر رقائق پر مشتمل تھی، لہذا انجیل کا نزول بطورِ تتمۂ تورات کے ہوا، جسے اساسی حیثیت حاصل تھی، اسی لئے جنوں نے انجیل کے بجائے تورات کا ذکر کیا۔

رسول اور نبی میں فرق

رسول اور نبی دو ایسے کلمات ہیں جو عندالافتراق، مترادف بن جاتے ہیں، یعنی رسول کی جگہ نبی اور نبی کی جگہ رسول کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے، البتہ عندالاجتماع آپس میں متباین ہونگے، چنانچہ دونوں میں فرق کیا جائے گا، فرق کے تعلق سے علماء کی مختلف آراء سامنے آتی ہیں، سب سے

معقول رائے یہ ہے کہ رسول وہ شخصیت ہے جس پر مستقل شریعت نازل ہوئی ہو اور اسے اس شریعت کو اپنی امت تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہو، جبکہ نبی وہ شخصیت ہے جو ایک قوم کی طرف مبعوث ہو، مگر اس پر نئی شریعت نہ اتری ہو بلکہ پرانی شریعت ہی کو پہنچانے کا پابند ہو۔

گویا نبی اور رسول دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوتے ہیں اور رسول صاحب شریعت جدیدہ ہوتا ہے جبکہ نبی شریعت سابقہ کی تبلیغ پر مکلف کیا جاتا ہے۔

رسول اور نبی ہر ایک کی ڈیوٹی مکمل دین پہنچانے کی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ۝] [1]

یعنی: رسولوں پر تو صرف واضح اور مکمل دین پہنچانے کا فریضہ ہے۔

یہی حکم خاتم النبیین محمد ﷺ کو دیا گیا، چنانچہ فرمایا:

[يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ‌ ؕ] [2]

یعنی: اے رسول! آپ کی طرف، آپ کے رب کی طرف سے جو کچھ اتارا گیا اسے پہنچا دیجئے، اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔

صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ایک طویل مرفوع حدیث کا ابتدائی مضمون یہ ہے:

(انه مابعث الله من نبی إلا و کان حقا علیه أن یدل أمته علی خیر ما یعلمه لهم وینذرهم عن شر مایعلمه لهم... الحدیث)

یعنی: اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھیجا اس پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ وہ اپنی امت کو خیر کے ہر راستے سے آگاہ کرے اور شر کے ہر راستے سے ڈرائے۔

[1] النحل:۳۵
[2] المائدۃ:۶۷

امت کے کرنے کا کام

واضح ہو کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی ذکر کردہ اس ذمہ داری کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بموجب اللہ تعالیٰ کا پورا دین بیان کر دیا، لہٰذا اب امتیوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی اختراع یا ابتداع کی بجائے اپنے نبی کے فرمان کی اتباع کریں اور یہ بات نوٹ کر لیں کہ انسانیت کی ہدایت اور اخروی فوز و فلاح کا راستہ، انبیاء کرام کی اطاعت کے ساتھ مربوط و منسلک ہے، اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبها السلام والتحیة کو مخاطب کر کے فرمایا:

[وَاِنۡ تُطِيۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا] [1]

اور اگر تم ان (محمد ﷺ) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔

دوسرا ایسا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے جہاں سے ہدایت جیسی مہنگی ترین دولت نصیب ہو سکے۔

انبیاء و رسل کے ذریعے اتمام حجت

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر مقام کے تمام لوگوں پر، کسی استثناء کے بغیر، انبیاء و مرسلین کے ذریعے اپنی حجت پوری فرمائی، ارشاد ہے:

[رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ] [2]

یعنی: اور (ہم نے) رسولوں کو مبعوث فرمایا جو خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں، تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد لوگوں کی اللہ تعالیٰ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تعلق سے جملہ انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت کی تکمیل، انبیاء

[1] النور:۵۴
[2] النساء:۱۶۵

ومرسلین کی بعثت کے ساتھ ہے، یہ حجت نہ تو کسی امام ومجتہد کے ساتھ ہے، نہ کسی پیر ومرشد کے ساتھ اور نہ ہی کسی قوم وبرادری کے ساتھ۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے کتاب التوحید میں امام زہری رحمہ اللہ کا ایک قول نقل فرمایا ہے، جو اسی عظیم منہج کی عکاسی کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

(من الله الرسالة وعلى رسول الله البلاغ وعلينا التسليم)

یعنی: پیام دین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اسے امت تک پہنچانا رسول اللہ کی ذمہ داری ہے جبکہ اسے من وعن تسلیم کرنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے شرح السنۃ میں بعض علماء سلف سے نقل فرمایا ہے:

(وقدم الإسلام لا يثبت إلا على قنطرة التسليم)

یعنی: قدم اسلام نہیں جم سکتا مگر منہج تسلیم پر۔

انبیاء ورسل کی تعداد کا مسئلہ

واضح ہو کہ انبیاء ومرسلین کی صحیح تعداد کسی صحیح وثابت نص سے نہیں ملتی، البتہ بعض انبیاء کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے اور بعض کا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

[وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ][1]

نیز فرمایا:

[وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ][2]

---
[1] النساء:۱۶۴
[2] غافر:۷۸

ان دونوں آیات کا مضمون ایک ہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سے انبیاء مبعوث فرمائے اور ان میں سے کچھ کا قرآن پاک میں تذکرہ فرمایا اور کچھ کا نہیں فرمایا۔

قرآن میں موجود انبیاء ورسل کے نام

جن انبیاء کے اسماء گرامی یا واقعات قرآن پاک میں مذکور ہیں ان کی تعداد پچیس ہے، جن میں سے اٹھارہ کا ذکر تو ایک ہی مقام پر ہے، چنانچہ سورۃ الانعام میں فرمایا:

[وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰي وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝][1]

یہ آیات مبارکہ اٹھارہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ناموں پر مشتمل ہیں، باقی سات انبیاء کا یہاں ذکر نہیں ہے، دوسرے متفرق مقامات پر ان کا تذکرہ موجود ہے، ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

آدم، ادریس، ہود، صالح، شعیب، ذوالکفل اور محمد صلوات اللہ وسلامہ وبرکاتہ علیہم اجمعین۔

تمام انبیاء مرد تھے

ان نصوص سے یہ بات آشکارہ ہو رہی ہے کہ تمام انبیاء مرد تھے، کسی عورت کو رتبۂ نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا][2] یعنی: ہم نے آپ سے پہلے مردوں ہی کو مبعوث فرمایا، البتہ نبوت کے بعد صدیقیت کا درجہ ہے جو خواتین کیلئے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ

---
[1] الانعام:۸۳-۸۶
[2] یوسف:۱۰۹

[مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ] [1]

اس آیت مبارکہ میں مریم علیہا السلام کو صدیقہ کہا گیا ہے۔

ثابت ہوا عورت نبی نہیں ہو سکتی اور نبوت کے بعد جو اشرف مدارج ومقامات ہیں مثلاً: صدیقیت، شہادت اور صالحیت وغیرہ، ان پر فائز ہو سکتی ہے۔

انبیاءِ کرام میں تفاضل

قرآن حکیم کے دو مقامات سے بظاہر دو مختلف باتیں سامنے آتی ہیں، جو بعض لوگوں کیلئے اشکال کا سبب بنتی ہیں: ایک مقام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کے مابین تفاضل یا فرقِ مراتب نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: [لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ] [2] یعنی: ہم رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

جبکہ دوسرے مقام پر فرمانِ باری تعالیٰ ہے: [تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۘ] [3] یعنی: یہ انبیاء کا گروہ جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔

پہلی آیت میں بظاہر تفاضل کی نفی ہے اور دوسری آیت تفاضل کو ثابت کرتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تعارض نہیں ہے، پہلی آیت جس میں تفاضل کی نفی مفہوم ہو رہی ہے، سے مراد اصل رسالت ونبوت ہے یعنی گروہِ انبیاء میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے کہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہیں، البتہ انبیاء کرام کے مابین مرتبہ ومقام کا فرق ضرور موجود وثابت ہے، جو اللہ تعالیٰ کی عطا سے انہیں حاصل ہوا [ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ] [4]

---

[1] المائدۃ:۷۵
[2] البقرۃ:۲۸۵
[3] البقرۃ:۲۵۳
[4] المائدۃ:۵۴

افضل اور اولو العزم رسول

چنانچہ انبیاءِ کرام میں سب سے افضل پانچ انبیاء ہیں، جنہیں اولو العزم ہونے کا شرف حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ] [1] یعنی: آپ صبر کیجئے جس طرح کہ اولو العزم رسولوں نے صبر کیا۔

یہ اولو العزم رسل پانچ ہیں: محمد ﷺ، ابراہیم، نوح، موسیٰ وعیسیٰ علیہم السلام، ان پانچوں کا ذکر قرآن پاک کی دو آیات میں موجود ہے: سورۃ الاحزاب میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠] [2]

اور سورۃ الشوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ] [3]

محمد اور ابراہیم علیہما السلام کی فضیلت

پھر ان پانچوں انبیاءِ کرام میں سے دو نبی سب سے افضل ہیں: ایک سیدنا محمد ﷺ دوسرے سیدنا ابراہیم علیہ السلام، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ہستیوں کو اپنا خلیل قرار دیا ہے، ان دو کے علاوہ کسی کیلئے مقامِ خلت ثابت نہیں ہے۔

مقامِ خلت، وفاداری اور دوستی کا سب سے اونچا مقام ہے، خلیل سے مراد ایسا دوست جس کی دوستی اور وفاشعاری میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ ہو، یا پھر خلیل سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا دوست

---

[1] الاحقاف:۳۵
[2] الاحزاب:۷
[3] الشوریٰ:۱۳

جس کی دوستی جسم کے تمام رگ ریشہ، روح، ہڈیوں اوران کے گودے تک میں متخلل یعنی سرایت کر چکی ہو۔

محمد ﷺ کی تمام انبیاء پر فضیلت

پھر ان دونوں ہستیوں میں سب سے افضل ہمارے نبی آخر الزمان محمد ﷺ ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:(أنا سيد ولد آدم) یعنی: میں پوری اولادِ آدم کا سردار ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اسراء ومعراج کے واقعہ میں، بیت المقدس میں محمد ﷺ کو تمام انبیاء کی امامت کا شرف حاصل ہوا، اور یہ بات معلوم ہے کہ امامت میں یہ تقدم، مطلقاً فضیلت کی دلیل ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے دن بھی پوری کائنات کی قیادت وسیادت کا شرف حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ کا وہ قرب نصیب ہوگا جس پر دوسرا کوئی فائز نہ ہو سکے گا، جسے وسیلہ جیسے عظیم نام کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے، (ثم سلوا الله لی الوسيلة)

ہمارا اس بات پر کامل یقین وایمان ہے کہ محمد ﷺ افضل الرسل ہیں، اور آپ ﷺ کی بعثت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام جنوں وانس پر سب سے بڑی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس نعمت عظیمہ کا احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

[لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝] [1]

یعنی: اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں، انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمادیا، جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت فرماتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وسنت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔

[1] آل عمران:۱۶۴

محمد ﷺ نبی آخر الزماں ہیں

محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، چنانچہ فرمایا:

[مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ] [1]

یعنی: محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، بلکہ اللہ کے رسول اور انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:(أنا خاتم النبيين لا نبي بعدي) یعنی: میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کو عالمگیر ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ ﷺ کو رہتی دنیا تک کے ہر انسان کا رسول قرار دیا گیا ہے:[قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا] [2] کہہ دو اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

دوسرے مقام پر فرمایا:[وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا] [3] اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کیلئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔

محمد ﷺ جنوں کے بھی نبی ہیں

جس طرح آپ ﷺ قیامت تک کے عالم انسانیت کے رسول ہیں اسی طرح جنوں کی طرف بھی مبعوث فرمائے گئے۔

فرمایا:[قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا

[1] الاحزاب:۴۰
[2] الاعراف:۱۵۸
[3] سبأ:۲۸

عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝] [1]

کہہ دیجئے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن پاک سنا تو کہا: ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو ہدایت کا راستہ دکھاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

گویا نبی ﷺ تمام جن وانس کی طرف مبعوث ہیں اور تمام جن وانس آپ ﷺ کی امت ہیں، امت کی دو قسمیں ہیں: ایک امتِ دعوت، دوسری امتِ اجابت۔

امتِ دعوت سے مراد وہ تمام جن وانس ہیں جو آپ ﷺ کی بعثت کے وقت موجود تھے اور جو قیامت تک آتے رہیں گے۔

جبکہ امتِ اجابت سے مراد وہ تمام جن وانس ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس دینِ حنیف میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمادی۔

یہود ونصاریٰ پر نبوت محمدی پر ایمان لانا لازم ہے

یہود ونصاریٰ، گو اپنے اپنے نبی یعنی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کے دعویدار ہیں، مگر محمد ﷺ کی بعثت کے بعد ان کی اتباع کا یہ دعویٰ ان کیلئے قطعاً مفید نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ وہ نبی آخر الزماں محمد ﷺ کی اتباع کے دائرہ میں داخل ہوں، آپ ﷺ کی شریعت نے سابقہ تمام انبیاء کی شریعتوں کو منسوخ کردیا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(والذی نفس محمد بیده !لایسمع بی أحد من هذه الأمة یهودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی أرسلت به إلا کان من أصحاب النار) [2]

یعنی: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میرے بارے میں اس

[1] الجن: ۱، ۲
[2] صحیح مسلم: ۲۴۰

امت کا جو فرد سنے گا خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی، پھر وہ اس طرح مرگیا کہ وہ میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان نہ لایا ہو تو وہ جہنم میں جائے گا۔

لہٰذا کسی یہودی کو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا دعویٰ مفید نہیں، نہ کسی عیسائی کو عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا دعویٰ نفع بخش ہوسکتا ہے۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ جماعتِ انبیاء میں سے کسی ایک نبی کی نبوت کی تکذیب تمام انبیاء کی نبوت کی تکذیب شمار ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: [كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ] [1]: قومِ نوح نے تمام مرسلین کی تکذیب کرڈالی۔

اب حالانکہ قومِ نوح کی طرف تو ایک نبی یعنی نوح علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، پھر جمع کا صیغہ کیوں؟ اسی لئے کہ ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف ہے۔ یہی حکمت درج ذیل آیات میں پنہاں ہے:

[كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ] [2]

[كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ] [3]

[كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ] [4]

[كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْــــَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ] [5]

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

یہ بات امت کے ایک ایک فرد کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ رسول اکرم ﷺ کی پیروی ہی

[1] الشعراء:۱۰۵
[2] الشعراء:۱۲۳
[3] الشعراء:۱۴۱
[4] الشعراء:۱۶۰
[5] الشعراء:۱۷۶

درحقیقت صراطِ مستقیم ہے،اس کے علاوہ صراطِ مستقیم ،لاکھ جتن کرنے کے باوجود کہیں سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

فرمان باری تعالیٰ ہے:

[وَاِنَّكَ لَتَدۡعُوۡهُمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴿۷۳﴾][1]

یعنی: آپ کی دعوت صراطِ مستقیم کی طرف ہے۔

نیز فرمایا:

[وَاِنَّكَ لَتَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴿۵۲﴾][2]

یعنی: آپ ﷺ صراط مستقیم کا راستہ دکھاتے ہیں۔

لہذا ہماری زندگیوں میں رسول اللہ ﷺ کی مبارک تعلیمات کا ہونا اور ہر لحظہ ہونا انتہائی ضروری ہے،ہم کھانے پینے سے زیادہ صراطِ مستقیم کے محتاج ہیں؛ کیونکہ کھانا پینا دنیا کا زاد ہے جس کیلئے فنا ہے،جبکہ صراطِ مستقیم زادِ آخرت ہے جس کیلئے ہمیشہ کا دوام وبقا ہے۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] المؤمنون:۷۳
[2] الشوریٰ:۵۲

ایمان کا پانچواں رکن: ایمان بالیوم الآخر

اس دن کو ''الیوم الآخر'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کا آخری دن ہے،یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہرانسان کی زندگی کے چار ادوار ہیں: ایک اپنی ماں کے پیٹ میں،دوسرا دنیوی زندگی،تیسرا برزخی زندگی اور چوتھا اخروی زندگی،تو چونکہ اخروی زندگی ہر انسان کا آخری دور ہے لہذا اسے دارالآخرۃ یا آخرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایمان بالآخرۃ سے مراد یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں ،موت کے بعد جو کچھ مذکور ہے اس کا اقرار اور مکمل تصدیق کرنا۔

مکی زندگی میں دعوت کے تین اہم ترین نکتے

رسولِ اکرم ﷺ کو اپنی تیرہ سالہ مکی زندگی میں ،کفار کی طرف سے اسی عقیدہ یعنی ایمان بالآخرۃ کے تعلق سے مخاصمت کا سامنا رہا،اسی لئے مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ کی دعوت تین نکتوں میں محصور رہی: ایک احقاقِ توحید،دوسرا اثباتِ رسالت اور تیسرا عقیدۂ آخرت۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آغازِ قرآن ہی میں ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو آخرت پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔

فرمایا: [وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ][1]

یعنی: متقین وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ساتھ پورا یقین رکھتے ہیں۔

[1] البقرة:۴

آگے فرمایا: [أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾] [1]

یعنی: یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

کفار کا انکارِ آخرت، محض اپنی ناقص بلکہ باطل عقل اور انتہائی گھٹیا سوچ کی بناء پر تھا، جس کا قرآن نے جا بجا ذکر کیا اور خوب رد بھی کیا، سورۃ الواقعہ کا مضمون ملاحظہ ہو:

[وَكَانُوا يَقُولُونَ أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ ﴿٤٧﴾ أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿٤٨﴾ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوعُونَ إِلَىٰ مِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ﴿٥١﴾ لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٥٣﴾ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿٥٤﴾] [2]

ترجمہ: اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈی ہو جائیں گے تو کیا ہم پھر دوبارہ اٹھا کھڑے کیے جائیں گے اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی؟ آپ کہہ دیجئے کہ یقیناً سب اگلے اور پچھلے ضرور جمع کیے جائیں گے ایک مقرر دن کے وقت پھر تم اے گمراہو جھٹلانے والو! البتہ کھانے والے ہو تھوہر کا درخت اور اسی سے پیٹ بھرنے والے ہو پھر اس پر گرم کھولتا پانی پینے والے ہو۔

کفارِ قریش کے انکارِ آخرت کی وجہ؟

گویا کفار ومشرکین کا انکار آخرت، محض اس فرضی اشکال پر قائم تھا کہ بعث بعد الموت، عقلاً محال ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک بلکہ عدم ایمان وایقان کا مظہر ہے، اُن کا اشکال تو یہ تھا کہ انسان کا وجود مکمل طور پر فنا ہونے کے بعد دوبارہ کیسے بن سکتا ہے، وہ یہ حقیقت سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ اللہ جس نے پہلی بار اس ڈھانچے کو بنایا، دوبارہ بھی بنانے پر قادر ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے

[1] البقرۃ:۵
[2] الواقعۃ:۵۵-۴۷

فرمان کے مطابق ہر انسان کا دوبارہ ڈھانچہ اس طرح تیار کر دیا جائے گا کہ ہاتھوں کی انگلیوں کے پوروں کے نشانات میں بھی کوئی فرق نہ ہوگا۔

[أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ﴿٣﴾ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ﴿٤﴾] [1]

ترجمہ: کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے ہی نہیں ہاں ضرور کریں گے ہم تو قادر ہیں کہ اس کی پور پور تک درست کر دیں۔

عقیدہ بعث بعد الموت کے دلائل

اللہ تعالیٰ نے عقیدہ بعث بعد الموت کا جا بجا ذکر کیا اور کفار کے مزعومہ اشکالات کا رد فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کے احقاق کیلئے تین طرح سے استدلال فرمایا۔

① انسان کو پہلی بار پیدا کرنا۔ اس بات کو مشرکین مکہ بھی تسلیم کرتے تھے، وجہ استدلال یہ ہے کہ جو ذات پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہے، اس کیلئے اس وجود کو دوبارہ بنانا کون سا مشکل ہے؟

[أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ﴿٧٧﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ﴿٧٨﴾ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾] [2]

ترجمہ: کیا انسان کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکا یک وہ صریح جھگڑالو بن بیٹھا اور اس نے ہمارے لئے مثال بیان کی اور اپنی (اصل) پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ آپ جواب دیجئے! کہ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے، جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔

[1] القیامۃ:۴
[2] یسین:۷۹-۷۷

دوسرے مقام پر فرمایا:

[اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ﴿۳۶﴾ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ﴿۳۷﴾ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ﴿۳۹﴾ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ﴿۴۰﴾] [1]

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا کیا وہ ایک گاڑھے پانی کا قطرہ نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ لہو کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ نے اسے پیدا کیا اور درست بنا دیا پھر اس سے جوڑے یعنی نر و مادہ بنائے کیا (اللہ تعالی) اس (امر) پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟

② دوسرا طریق استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے بنجر اور مردہ زمین کو شاداب کر دیا، تو جو ذات مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے، اس کیلئے مردہ انسانوں کو زندہ کرنا کون سا مشکل ہے؟

ارشاد فرمایا:

[وَمِنۡ اٰیٰتِہٖۤ اَنَّکَ تَرَی الۡاَرۡضَ خَاشِعَۃً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡہَا الۡمَآءَ اہۡتَزَّتۡ وَ رَبَتۡ ؕ اِنَّ الَّذِیۡۤ اَحۡیَاہَا لَمُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ؕ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۹﴾] [2]

ترجمہ: اس اللہ کی نشانیوں میں سے (یہ بھی) ہے کہ تو زمین کو دبی دبائی دیکھتا ہے پھر جب ہم اس پر مینہ برساتے ہیں تو وہ تر و تازہ ہو کر ابھرنے لگتی ہے جس نے اسے زندہ کیا وہی یقینی طور پر مُردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے، بیشک وہ ہر (ہر) چیز پر قادر ہے۔

مزید ارشاد فرمایا:

[وَہُوَ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتۡ سَحَابًا ثِقَالًا سُقۡنٰہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنۡزَلۡنَا بِہِ الۡمَآءَ فَاَخۡرَجۡنَا بِہٖ مِنۡ کُلِّ

[1] القیامۃ:۴۰-۳۶

[2] فصلت:۳۹

الثَّمَرٰتِ ؕ کَذٰلِکَ نُخۡرِجُ الۡمَوۡتٰی لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۵۷﴾] [1]

ترجمہ: اور وہ ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں، تو ہم اس بادل کو کسی خشک سرزمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ یوں ہی ہم مردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم سمجھو۔

③ تیسرا طریق استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالی نے آسمانوں اور زمینوں کے خالق ہونے کا ذکر فرمایا، تو جو ذات آسمانوں اور زمینوں جیسی عظیم مخلوقات پیدا کرنے پر قادر ہے، اس کیلئے انسان کا ڈھانچہ بنانا کونسا مشکل ہے؟

[اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ وَ لَمۡ یَعۡیَ بِخَلۡقِہِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ؕ بَلٰۤی اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۳۳﴾] [2]

ترجمہ: کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو؟ وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

نیز فرمایا:

[اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ قَادِرٌ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَہُمۡ وَ جَعَلَ لَہُمۡ اَجَلًا لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَاَبَی الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿۹۹﴾] [3]

ترجمہ: کیا انہوں نے اس بات پر نظر نہیں کی کہ جس اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کی پیدائش پر پورا قادر ہے، اسی نے ان کے لئے ایک ایسا وقت مقرر کر رکھا ہے جو شک شبہ سے یکسر خالی ہے، لیکن ظالم لوگ انکار کئے بغیر رہتے ہی نہیں۔

[1] الاعراف:۵۷

[2] الاحقاف:۳۳

[3] الاسراء:۹۹

قیامت پر ایمان لانے کا مطلب

قیامت پر ایمان لانا، ارکان ایمان میں سے ہے، اور اس سے مراد ہر اس شئ پر ایمان لانا ہے، جس کا تعلق مابعد الموت سے ہے، بشرطیکہ وہ کتاب وسنت میں مذکور ہو؛ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ ہر مرنے والے کی قیامت، اس کی موت ہی سے قائم ہوجاتی ہے، اور وہ دار العمل سے دار الجزاء کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دو گھر بنائے ہیں: ایک دار دنیا، دوسرا دار آخرت۔

ان دونوں گھروں کے مابین خصوصی حد فاصل ہر انسان کی موت ہے، جبکہ عمومی حد نفخ صور ہے۔

قیامت انتہائی برے لوگوں پر قائم ہوگی

نفخ صور سے زمین پر موجود ہر زندہ انسان کی موت واقع ہوجائے گی، اور شریعت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ انتہائی برے اور بدبخت ہونگے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: (بروایت صحیح بخاری)

"لا تقوم الساعة إلا على شرار الناس"

یعنی: قیامت انتہائی برے لوگوں پر قائم ہوگی۔

دوسری حدیث میں "إلا على حثالة الناس" بھی ہے، جس کا معنی انتہائی فضول لوگ جو کسی ذکر کے قابل نہیں۔

ایک اور حدیث میں جسے امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے:

"لا تقوم الساعة حتى لا يقال في الأرض الله الله"

یعنی: اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک ایک شخص بھی صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ کو ماننے والا ہوگا۔

موت کے بعد دو زندگیاں

واضح ہو کہ مرنے کے بعد زندگی کی دو قسمیں ہیں:

① برزخی حیات، یہ زندگی موت سے لیکر نفخ صور تک ہے۔ نفخ صور سے مراد وہ دوسرا صور ہے جس کے پھونکنے سے بعث کا عمل شروع ہوجائے گا، برزخی حیات کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے علم میں نہیں، لہذا برزخی حیات کا کوئی پہلو نہ تو دنیوی حیات پر قیاس کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اپنی عقل ودانش سے سمجھا جاسکتا ہے۔ لہذا ایک انسان کی عافیت وسعادت کا اصل نکتہ یہی ہے کہ وہ اس حیات کے تعلق سے سارا علم صرف کتاب وسنت سے حاصل کرے، کتاب وسنت میں جو کچھ مذکور ہے اس پر کسی اشکال یا اعتراض کے بغیر ایمان لے آئے، نیز یہ کہ کتاب وسنت سے ہرگز ہرگز تجاوز اختیار نہ کرے۔

② دوسری حیات، اخروی حیات کہلاتی ہے، جو دوسرے صور کے پھونکے جاتے ہی شروع ہوجائے گی۔

برزخی اور اخروی دونوں حیاتوں میں ہر انسان، شریعت کے بتائے ہوئے قواعد کے مطابق، جزاء یا سزا پائے گا۔

آخرت پر ایمان لانے کی تفصیل

یوم آخرت پر ایمان لانے سے مراد چند امور ہیں:

① قیامت کے وقوع پر ایمان لانا، اور یہ ماننا کہ اللہ تعالیٰ تمام اہل قبور کو اٹھائے گا، چنانچہ صور پھونکا جائے گا جس سے تمام اہل قبور زندہ ہوکر، رب العالمین کو حساب وکتاب دینے کیلئے میدان محشر میں جمع ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ⑯] [1]

[1] المؤمنون: ١٦

یعنی: پھر قیامت کے دن بلاشبہ تم سب اٹھائے جاؤ گے۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

[وَّحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا﴿۴۷﴾][1]

یعنی: اور ان لوگوں کو ہم جمع کرلیں گے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"یحشر الناس یوم القیامۃ حفاۃ غرلا"

یعنی: ہر شخص برہنہ، ننگے پاؤں اور غیر مختون اٹھایا جائے گا۔

② قیامت کے دن کے حوالے سے شریعت کے ذکر کردہ تمام امور اور جملہ اخبار پر ایمان لانا، مثلاً: لوگوں کا برہنہ، ننگے پاؤں، غیر مختون اور خالی ہاتھ اٹھائے جانا۔

جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

[يَوۡمَ نَطۡوِى السَّمَآءَ كَطَىِّ السِّجِلِّ لِلۡكُتُبِ‌ؕ كَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِيۡدُهٗ‌ ؕ وَعۡدًا عَلَيۡنَا‌ ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيۡنَ‏﴿۱۰۴﴾][2]

ترجمہ: جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ لیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں، جیسے کہ ہم نے اول دفعہ پیدائش کی تھی اسی طرح دوبارہ کریں گے۔ یہ ہمارے ذمے وعدہ ہے اور ہم اسے ضرور کرکے (ہی) رہیں گے۔

اسی طرح قرآن وحدیث میں ذکر کردہ دیگر احوال واخبار پر ایمان لانا۔ مثلاً: حوضِ کوثر، شفاعت، پل صراط، جنت اور جہنم وغیرہ۔

اور اس سے بھی قبل احوالِ قبور پر ایمان لانا بھی عقیدۂ آخرت کا حصہ ہے، مثلاً: منکر ونکیر فرشتوں کا ہر شخص سے سوال کرنا، نعیمِ قبور اور عذابِ قبور وغیرہ۔

---

[1] الکہف: ۴۷

[2] الانبیاء: ۱۰۴

ایمان کا پانچواں رکن

ایمان کا پانچواں رکن "ایمان بالیوم الآخر" ہے، جس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی، اور فتنۂ قبر پر ایمان لانا بھی ایمان بالیوم الآخر کا لازمی حصہ ہے، جس کے بغیر آخرت پر ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔

فتنۂ قبر پر ایمان کا مطلب

فتنۂ قبر پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ قبر کے بارہ میں شریعت مطہرہ کی بیان کردہ ہر بات کو من وعن تسلیم کرلیا جائے، اور ان امور میں سے کسی امر کو اپنی عقل وخرد پر نہ پرکھا جائے۔

ہر شخص کا مرنا اور قبر میں جانا حق ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ۙ‏﴿۲۱﴾][1]

یعنی: پھر اسے موت دے گا، پس قبر میں اتار دے گا۔

قبر سے کیا مراد ہے؟

واضح ہو کہ قبر سے مراد وہ گڑھا نہیں ہے جسے لوگ کھود کر تیار کرتے ہیں، بلکہ انسان مرنے کے بعد جہاں بھی ہو وہی اس کی قبر ہے، ہمارے معاشرہ میں ایک غلط جملے کا رواج ہے، کوئی شخص ڈوب جائے یا جل جائے یا اسے کوئی جانور کھا جائے تو کہتے ہیں کہ اسے تو قبر بھی نصیب نہیں ہوئی۔

اس قسم کا جملہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا انکار ہے: [ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقۡبَرَهٗ ۙ‏﴿۲۱﴾] کیونکہ یہ فرمان اس امر کا متقاضی ہے کہ قبر ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے، چنانچہ مرنے کے بعد جو شخص جہاں بھی ہو وہی اس کی قبر ہے، اور وہیں فتنۂ قبر قائم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر شئ پر قادر ہے، اپنی ناقص بلکہ

---

[1] عبس: ۲۱

باغی عقول سے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک یا انکار، باعث حیرت وضلالت ہے، بلکہ موجب کفر بھی، والعیاذ باللہ۔

قبر نعمتوں یا عذاب کی جگہ ہے

ہمارا ایمان ہے کہ فتنۂ قبر حق ہے، یہ بھی ایمان ہے کہ قبر میں مومنین صالحین، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متمتع ہوں گے، جبکہ کفار یا عصاۃ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔

قولہ تعالیٰ: [وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۝۱۰۰][1] کا تقاضا ہے کہ نعمتوں یا عذاب کا یہ سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔

قبر کی نعمتیں اور عذاب روح اور جسم دونوں کیلئے ہیں

ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ قبر کی نعمتیں، روح اور جسم دونوں کیلئے ہیں اسی طرح قبر کا عذاب بھی۔

اس پر کتاب وسنت کے دلائل موجود ہیں اور یہ عقیدہ، اجماعِ امت سے بھی ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں شہید کے متمتع نعمت ہونے کا ذکر فرمایا ہے:

[وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْیَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ۝۱۶۹][2]

ترجمہ: جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کیے گئے ہیں ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزیاں دیئے جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں اس تعلق سے لوگوں کے ہر قسم کے شعور وادراک کی نفی فرمادی، گویا کوئی شخص اپنی عقل کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کی حقیقت وکیفیت کا نہ تو ادراک کرسکتا ہے، نہ کسی قسم کا تعقل۔

[1] المؤمنون:۱۰۰
[2] آل عمران:۱۶۹

[وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْیَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝۱۵۴][1]

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے۔

عذابِ قبر کے اثبات کیلئے، قرآن مجید کا وہ بیان کافی ہے جس میں آلِ فرعون کو مسلسل عذاب دیئے جانے کا ذکر ہے:

[اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا ۚ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝۴۶][2]

ترجمہ: آگ ہے جس کے سامنے یہ ہر صبح شام لائے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (فرمان ہوگا کہ) فرعونیوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالو۔

یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ آل فرعون کو قبر میں آگ کا شدید عذاب دیا جارہا ہے، اور جب قیامت قائم ہوگی تو اس سے کہیں زیادہ شدید آگ کے عذاب میں منتقل ہوجائیں گے۔

معاشرہ میں رائج ایک غلط جملہ

یہاں بھی ایک غلط جملہ، جو ہمارے معاشرہ میں رائج ہے، کاذکر کرنا ضروری ہے، جب کوئی شخص مرتا ہے اور اسے قبر میں دفن کردیا جاتا ہے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنے آخری ٹھکانے یا آرام گاہ میں منتقل ہوگیا ہے۔

یہ جملہ انتہائی غلط ہے، اس سے آخرت کا انکار مترشح ہورہا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قبر آخری ٹھکانہ نہیں ہے، بلکہ نفخ صور کے بعد قیامت کو آخری ٹھکانہ قرار دیا گیا ہے:

[1] البقرة:۱۵۴
[2] غافر:۴۶

[ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾][1]

ترجمہ: پھر اسے موت دی اور پھر قبر میں دفن کیا۔ پھر جب چاہے گا اسے زندہ کردے گا۔

فتنۂ قبر کے حوالے سے چند احادیث

فتنۂ قبر کے حوالے سے چند احادیث ملاحظہ ہوں:

صحیح بخاری میں ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا صلاۃ الکسوف والے قصہ میں روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مامن شی لم أکن أریته إلا رأیته فی مقامی، حتی الجنة والنار، فأوحی إلی أنکم تفتنون فی قبورکم مثل أو قریبا -لاأدری أی ذلک قالت أسماء- من فتنة المسیح الدجال، یقال: ما علمك بهذا الرجل؟ فأما المؤمن أو الموقن -لاأدری بأیهما قالت أسماء- فیقول: هو محمد هو رسول الله، جاء نا بالبینات والهدی، فأجبنا واتبعنا، هو محمد ثلاثا، فیقال: نم صالحا، قد علمنا إن کنت لموقنا به. وأما المنافق أو المرتاب -لاأدری أی ذلک قالت أسماء- فیقول: لاأدری، سمعت الناس، یقولون شیئا فقلته.

ترجمہ: اب تک جو کچھ مجھے نہیں دکھایا گیا تھا وہ میں نے آج اپنے اس مقام میں دیکھ لیا ہے، حتی کہ جنت اور جہنم بھی۔ پس میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی قبروں میں مبتلائے فتنہ کئے جاؤ گے جو فتنۂ دجال کے مثل یا قریب ہوگا، کہا جائے گا: تمہارا اس شخص کے بارہ میں کیا علم ہے؟ مؤمن (یا صاحب یقین) فوراً جواب دے گا: وہ محمد ہیں، وہ اللہ کے رسول ہیں، ہمارے پاس دلائل اور ہدایت کے ساتھ تشریف لائے، پس ہم نے ان کی دعوت کو قبول کرلیا اور ان کی اتباع اختیار کرلی، (تین بار کہیں گے کہ وہ محمد ﷺ ہیں۔)

[1] غافر: ۴۶

اس سے کہا جائے گا: تم آرام سے سو جاؤ، تحقیق ہمیں علم تھا کہ تم محمد ﷺ کی پورے یقین کے ساتھ اتباع کرنے والے ہو۔

منافق (یا شکوک وشبہات کا شکار شخص) اس سوال کے جواب میں کہے گا: میں نہیں جانتا، میں نے تو لوگوں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا وہی کہہ ڈالا۔

وفی مصنف عبدالرزاق (٦٧٤٤) عن ابن جریج قال: أخبرنی أبو الزبیر أنه سمع جابر بن عبدالله یقول: إن هذه الأمة تبتلی فی قبورها، فإذا دخل المؤمن قبره، وتولی عنه أصحابه، أتاه ملك شدید الانتهار، فقال: ما کنت تقول فی هذا الرجل؟ فیقول المؤمن: أقول إنه رسول الله ﷺ وعبده. فیقول له الملك: اطلع إلی مقعدك الذی کان لك من النار، فقد أنجاك الله منه، وأبدلك مکانه مقعدك الذی تری من الجنة؟ فیراهما کلتیهما. فیقول المؤمن: أبشر أهلی؟ فیقال له: اسکن؛ فهذا مقعدك أبدا. والمنافق إذا تولی عنه أصحابه یقال له: ما کنت تقول فی هذا الرجل؟ فیقول: لا أدری، أقول ما یقول الناس. فیقال له: لا دریت، انظر مقعدك الذی کان لك من الجنة، قد أبدلك الله مکانه مقعدك من النار.

ترجمہ: مصنف عبدالرزاق میں ہے، ابن جریج فرماتے ہیں: مجھے ابوالزبیر نے بیان کیا، انہوں نے جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ سے سنا وہ فرماتے ہیں: بلاشبہ یہ امت اپنی قبروں میں امتحان وابتلاء میں ڈالی جائے گی، جب مؤمن قبر میں داخل ہوگا اور اس کے ساتھی اسے دفن کرکے واپس لوٹ جائیں گے تو ایک فرشتہ شدید غیظ وغضب سے بھرپور اس کے پاس آئے گا، اور کہے گا: تم اس شخص کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ مؤمن کہے گا: میں یہی کہتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور اس کے بندے ہیں۔ فرشتہ کہے گا: اپنا وہ ٹھکانہ دیکھ لو جو تمہارے لئے جہنم میں تیار کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے خلاصی عطا فرمادی ہے، اور اس کے بدلے میں جنت

میں تمہارا ٹھکانہ بنادیا ہے جو تم سامنے دیکھ رہے ہو۔وہ بندۂ مومن اپنے ان دونوں ٹھکانوں کو دیکھے گا۔تب وہ فرشتے سے کہے گا: کیا میں اپنے گھروالوں کو خوشخبری دینے کیلئے جاسکتا ہوں؟ فرشتہ کہے گا: پرسکون ہوکر یہیں رہو، یہ تمہارا ہمیشہ کا ٹھکانہ ہے۔

منافق کو جب اس کے دوست واحباب دفن کرکے لوٹ جائیں گے، تو اس سے کہا جائے گا: تم اس شخص کے بارہ میں کیا کہتے ہو؟ وہ جواب دے گا: میں کچھ نہیں جانتا، میں تو صرف وہی کچھ کہا کرتا تھا جو لوگ کہتے تھے، تو اس سے کہا جائے گا: تونے کچھ نہ جانا، ذرا اپنا وہ ٹھکانہ دیکھ لو جو تمہارے لئے جنت میں تیارکیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے، جہنم میں تمہارا ٹھکانہ تیارکردیا ہے۔

اس کی سند صحیح ہے اور یہ حدیث حکماً مرفوع ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

فتنۂ قبر کے بارہ میں مندرجہ بالانصوص میں مذکور ایک جملہ سے کچھ لوگ شبہ کا شکار ہوگئے، وہ جملہ فرشتوں کا یوں پوچھنا: "ما تقول فی ھذا الرجل" یا "ماعلمك بھذا الرجل" ہے، یعنی اس شخص کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔

اس جملہ کے سیاق سے لگتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وہاں موجود ہونگے، جن کی طرف فرشتے اشارہ کرکے سوال کریں گے، جس سے آپ ﷺ کا قبر میں حاضر وناظر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یہ محض ایک باطل اور بے بنیاد شبہ ہے، مسند احمد کی ایک حدیث میں پورا جملہ یوں مذکور ہے: "ماھذا الرجل الذی بعث فیکم" یہ شخص کیا ہے جو تمہارے بیچ مبعوث کیا گیا؟ "الذی بعث فیکم" کی صفت اس بات پر دال ہے کہ "ھذا" کا اشارہ کسی مبصر یا محسوس کی طرف نہیں ہے، بلکہ موجود فی الذہن کی طرف ہے۔

تبھی تو مؤمن اس سوال کا جواب دے گا: "ھو محمد ھو رسول اللہ" اور یہ بات معلوم ہے

کہ "ھو" کی اصل وضع ضمیر برائے بعید ہے۔ ورنہ اس کا جواب یوں ہونا چاہئے تھا: "ھذا محمد ھذا رسول اللہ"۔

کسی بھی غائب شخص کو ذہن میں رکھ کر اس کیلئے ھذا کی ضمیر استعمال کرنا، اہل عرب کے اسلوبِ کلام میں شائع وذائع ہے۔

اس کی مثال صحیح بخاری میں مروی، حدیث ہرقل میں مذکور ایک جملہ سے دی جاسکتی ہے، ہرقل نے ابوسفیان سے پوچھا تھا: إني سائل عن ھذا الرجل ... الخ۔ یعنی: میں اس شخص کے بارہ میں کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔

یہاں ہرقل، جو اب تک نہ تو نبی ﷺ کو جانتا ہے، نہ ہی آپ پر ایمان لایا اور نہ کبھی لاسکا، نے نبی ﷺ کیلئے "ھذا" کا اشارہ استعمال کیا ہے، اور ظاہر ہے یہ اشارہ مبصَر شئ کیلئے نہیں ہے، بلکہ مافی الذہن کی طرف ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہرقل کے قول: "إني سائل عن ھذا الرجل" میں ہرقل کا اشارہ، مافی الأذھان کی بجائے مافی الأعیان کی طرف ہے، جیسا کہ اہل شبہ کا فہم ہے، تو پھر یہ بات ایک لطیفہ سے کم نہ ہوگی کہ وہ ہرقل جو رسول اللہ ﷺ کو جانتا تک نہیں، نہ اسے آپ ﷺ پر ایمان لانے کی توفیق ہوئی، مگر وہ آپ ﷺ کے حاضر ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتا تھا۔ فیا للعجب۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان لوگوں پر "ما فی الأذھان" اور "ما فی الأعیان" کے مابین اشتباہ ہوگیا ہے، ان لوگوں نے مافی الاذہان کو مافی الاعیان سمجھ لیا ہے، اور یہ بہت بڑی خرابی ہے۔[1]

فتنۂ قبر سے متعلق مسند احمد کی ایک طویل حدیث

مسند احمد بن حنبل میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں فتنۂ قبر کا ذکر

[1] درس صحیح بخاری از حافظ محمد گوندلوی رحمہ اللہ ص ۳۸۰

ہے، جس کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں: مؤمن جب قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو:

فیأتیه ملکان فیجلسانه فیقولان له: من ربك؟ فیقول: ربی الله. فیقولان له: ما دینك؟ فیقول: دینی الإسلام. فیقولان له: ما هذا الرجل الذی بعث فیکم؟ فیقول: هو رسول الله ﷺ.

یعنی: مؤمن کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھا لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ پوچھتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ پوچھتے ہیں: یہ شخص کیا ہے جو تمہارے بیچ مبعوث کیا گیا؟ وہ جواب دیتا ہے: وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔

اس شخص کی بابت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے:

فأفرشوه من الجنة وألبسوه من الجنة وافتحوا له بابا إلى الجنة. قال فیأتیه من رَوحها وطیبها، ویفسح له فی قبره مد بصره.

یعنی: اس کیلئے جنت کا بستر بچھا دیا جائے اور اسے جنت کا لباس پہنا دیا جائے اور اس کیلئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جائے، چنانچہ جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں اسے مستقل پہنچتی رہتی ہیں اور اس کی قبر کو تا حدِ نگاہ کشادہ کر دیا جاتا ہے۔

کافر (یا نافرمان) شخص کے ذکر میں فرمایا:

ویأتیه ملکان فیجلسانه. فیقولان له: من ربك؟ فیقول: هاه هاه لا أدری! فیقولان له: ما دینك؟ فیقول: هاه هاه لا أدری! فیقولان له: ما هذا الرجل الذی بعث فیکم؟ فیقول: هاه هاه لا أدری.

یعنی: کافر کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اس سے پوچھتے ہیں؟ تیرا رب کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے: ہائے ہائے (کلمہ تعجب) میں نہیں جانتا۔ پھر وہ پوچھتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ جواب

دیتا ہے: ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔ پھر وہ پوچھتے ہیں: یہ شخص کیا ہے جو تمہاری طرف مبعوث کیا گیا؟ وہ جواب دیتا ہے: ہائے ہائے میں نہیں جانتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آتا ہے:

أفرشوه من النار، وافتحوا له بابا إلى النار. فیأتیه من حرها وسمومها، ویضیق علیه قبره حتی تختلف أضلاعه.

یعنی: اسے جہنم کا بستر مہیا کر دو، اور ایک دروازہ جہنم کی طرف کھول دو، چنانچہ جہنم کی گرم ہوائیں اسے مستقل پہنچتی رہیں گی، اور اس کی قبر کو اس قدر تنگ کر دیا جائے گا کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں داخل ہو جائیں گی۔

شریعت کی ایک عظیم برکت وسماحت

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ہر شخص سے قبر میں تین سوال کئے جائیں گے، یہ شریعت کی برکت اور سماحت ہے کہ ان تین سوالوں کی پہلے سے آگاہی دے دی گئی ہے، تاکہ اللہ کے بندے ان کی خوب تیاری کر لیں، یہ تینوں سوال کس قدر آسان ہیں! ابھی تو ایک کافر یا منافق یا فاسق جنہیں ان سوالوں کے جواب سجھائی نہ دیں گے، وہ کلمۂ تعجب (ہاہ ہاہ) استعمال کریں گے، یعنی اظہارِ تعجب کریں گے کہ یہ سوال تو بظاہر انتہائی آسان ہیں، مگر تعجب ہے کہ ہمیں ان کے جواب سجھائی نہیں دے رہے۔

قبر کے سوالات کے صحیح جوابات کی توفیق کیسے میسر ہوگی؟

اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر بھلا ان سوالوں کے جواب کیسے ممکن ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان تینوں سوالوں کی صحیح اور کامل معرفت کسے تھی اور کسے نہیں تھی، نیز اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ان تینوں سوالوں کے مقتضیٰ پر کس نے عمل کیا اور کس نے نہیں کیا۔

مسند احمد: ۱۸۵۳۴

چنانچہ قبر کے سوال: من ربك؟ کا صحیح جواب وہ شخص دے گا جسے رب کی معرفت ہو، اس کی توحید کی کامل پہچان ہو، اس کے علاوہ کسی کو ربوبیت اور الوہیت کے قابل قرار نہ دیا ہو اور پوری زندگی اس نفیس عقیدہ کے مقتضیٰ پر عمل پیرا رہا ہو۔

لیکن جو شخص رب تعالیٰ اور اس کی توحید کی معرفت سے نابلد و ناآشنا رہا، اس کے علاوہ دوسروں کو مشکل کشا یا حاجت روا قرار دیا، یا پھر ان کی عبادت کا مرتکب رہا، وہ بے تحاشا علم کے باوجود اس سوال کے جواب سے محروم کر دیا جائے گا، اس کا علمی خزانہ اس کے کسی کام نہ آئے گا جس پر وہ تعجب کرتے ہوئے ھاہ ھاہ لا ادری کہے گا۔

اسی طرح فرشتوں کے سوال: مادینك؟ کے صحیح جواب کی توفیق صرف اس بندہ کو میسر آئے گی، جس نے پوری زندگی دین اسلام کی عظیم امانت کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا، اس کے عقیدہ، عمل اور خلق وسلوک کا مبنیٰ صرف دین اسلام رہا۔

لیکن جو شخص دین اسلام کے علاوہ دیگر ادیان سے مرعوب رہا اور ان کے قواعد وضوابط اور مبانی اختیار کرنے میں پیش پیش رہا، اور اس کی زندگی دین اسلام اور دیگر ادیان کے مابین تخلیط وتلبیس کی آئینہ دار رہی، اللہ تعالیٰ کے فرمان: [لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝][1] اور فرمان: [ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً][2] کے مخالف چلتا رہا، وہ اس سوال کے جواب سے قطعی محروم کر دیا جائے گا۔

اسی طرح فرشتوں کے سوال: من نبيك؟ کے صحیح جواب کی توفیق اسی بندہ کو میسر آئے گی، جس کی پوری زندگی کی اتباع کا محور، محمد ﷺ ہوں گے، جس کا عقیدہ یہ ہوگا کہ ہر عمل پر رسول اللہ ﷺ کی سنت کا رنگ ہونا ضروری ہے، جس کی پوری زندگی اس حدیث کی آئینہ دار رہی:

[1] آل عمران: ۷۱
[2] البقرۃ: ۲۰۸

"من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد"

یعنی: جس نے بھی کوئی ایسا عمل کیا جس پر ہماری مہر تصدیق نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

لیکن جس شخص نے عملاً اس فرمانِ مصطفیٰ کی دھجیاں بکھیر دیں اور محمد ﷺ کی اطاعت کرکے اپنے دین کو خالص رکھنے کی بجائے دوسروں کی آراء کا پیروکار بن کر، اپنے دین کو ملاوٹی کر لیا، تو وہ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر رہے گا؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے توفیق حاصل نہ ہو سکے گی۔ (والعیاذ باللہ)

سلف صالحین قبر کو بہت یاد رکھا کرتے تھے

چونکہ قبر آخرت کا پہلا زینہ ہے، جسے سلف صالحین بہت یاد رکھا کرتے تھے، سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اسی حکمت کے پیش نظر، کسی بھی قبر کو دیکھ کر زار و قطار رو دیا کرتے تھے، خود رسول اللہ ﷺ زیارتِ قبور کی ترغیب دلایا کرتے تھے اور موت کو سب سے بہتر واعظ قرار دیا کرتے تھے، تاکہ لوگ اس اہم گھاٹی کی تیاری کی طرف متوجہ ہوں۔

ایک عظیم دعا جس میں قبر کے سوالوں کا جواب مذکور ہے

واضح ہو کہ یہ تیاری انہی تین سوالوں کے صحیح جواب میں منحصر ومرکوز ہے: "من ربك؟ مادينك؟ من نبيك؟"

اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا کے بار بار پڑھنے کا حکم دیا اور اس کی فضیلت بیان فرمائی، چنانچہ صحیح مسلم میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے:

من قال رضيت بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا، دخل الجنة.

یعنی: جو شخص رضيت بالله ربا وبالإسلام دينا وبمحمد نبيا، کہے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

آپ ﷺ یہ کلمات اذان کے جواب میں بھی کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ صبح وشام کے اذکار میں بھی یہ کلمات تین تین بار دہرایا کرتے تھے۔

اگر آپ غور کریں گے تو ان کلمات میں قبر ہی کے تینوں سوالوں کی تیاری کی بابت تلقین موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ذاق طعم الإيمان من رضی باللہ ربا وبالإسلام دينا وبمحمد رسولا.[1]

یعنی: جو شخص اللہ تعالیٰ کو رب مان کر، اسلام کو اپنا دین مان کر اور محمد ﷺ کو اپنا رسول مان کر راضی ہو گیا اس نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا۔

اس حدیث میں بھی مذکور تینوں امور قبر کے سوالات ہی سے متعلق ہیں، فضیلت بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ان کلمات کو مکمل معرفت کے ساتھ پڑھا جائے تاکہ قبر کی گھاٹی کی تیاری ہو سکے۔

عذابِ قبر سے پناہ کی دعائیں

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "إذا تشهد أحدكم فليستعذ بالله من أربع، يقول: اللهم إني أعوذبك من عذاب جهنم ومن عذاب القبر ومن فتنة المحيا والممات ومن شر فتنة المسيح الدجال.

یعنی: جب تم میں سے کوئی اپنی نماز میں تشہد میں بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کی چار چیزوں سے پناہ طلب کیا کرے اور یوں کہا کرے: اے اللہ! میں جہنم کے عذاب سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اور قبر کے عذاب سے بھی، اور زندگی اور موت کے فتنہ سے بھی، اور دجال کے فتنہ کے شر سے بھی۔

ویسے بھی رسول اللہ ﷺ عمومی طور پر عذابِ قبر سے پناہ طلب کیا کرتے تھے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال کان رسول اللہ ﷺ یدعو: اللھم إنی أعوذبك

[1] صحیح مسلم

من عذاب القبر ومن عذاب النار ومن فتنة المحيا والممات ومن فتنة المسيح الدجال.

یعنی: ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ بکثرت یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں عذابِ قبر سے، عذابِ جہنم سے، زندگی اور موت کے فتنے سے، اور دجال کے فتنہ سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کا فتنۂ قبر اور عذابِ قبر سے پناہ طلب کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گھاٹی انتہائی شدید اور مھیب ہے۔

قبر کے سوالوں کے جواب کی تیاری کیلئے ایک مفید کتاب

ضروری ہے کہ قبر کی طرف جانے والا ہر انسان تیاری کرکے جائے، اور تیاری کیلئے ان تین سوالات کے فہم کیلئے محنت شاقہ کی ضرورت ہے، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے، جس کا نام "الأصول الثلاثة وأدلتها" ہے، یعنی تین اصول اور ان کے دلائل، اس رسالہ میں جن تین اصولوں کا ذکر ہے وہ یہ ہیں:

① رب کی معرفت

② دین کی معرفت

③ نبی ﷺ کی معرفت

اور یہی قبر کے سوالات ہیں، اس رسالہ کا مطالعہ نہایت اہم ہے، ہمارا یہ مشورہ ہے کہ مساجد ومدارس میں اس کی تعلیم کا اہتمام ہو۔ والتوفیق بید اللہ تعالیٰ

قبر کے معاملہ کی سنگینی

قبر اور قبرستان کا معاملہ کس قدر سنگین اور خطرناک ہے، اس کا اندازہ اس حدیث سے بھی ہوتا ہے:

عن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ أن النبی ﷺ قال: (إن ھذہ الأمة تبتلی فی قبورھا، فلولا أن لا تدافنوا لدعوت اللہ أن یسمعکم من عذاب القبر الذی أسمع منه)[1]

یعنی: زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک یہ امت اپنی قبروں میں مبتلائے فتنہ کی جاتی ہے، اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مُردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں ضرور دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تھوڑا سا عذاب قبر سنا دے، جو میں سنا کرتا ہوں۔

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عذابِ قبر انتہائی شدید ہے کہ اس کی ایک جھلک دیکھ لینے یا ایک چیخ سن لینے سے، پوری دنیا اس قدر خوف وہراس میں مبتلا ہو جائے کہ کوئی قبرستان کا رُخ ہی نہ کرے، اپنے مرے ہوئے عزیزوں کو دفن کرنے کی ہمت وجرأت ہی نہ کرے، والعیاذ باللہ۔

لہٰذا لازم ہے کہ ہم فتنۂ قبر سے اپنے رب تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے رہیں، اور وہ تیاری کریں جو اس انتہائی پُر وحشت مقام پر کام آئے گی۔

اللھم إنا نعوذبك من فتنة القبر ومن عذاب النار.

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

قبر کی نعمتیں یا عذاب جسم وروح دونوں پر ہوگا

اہل السنہ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ قبر کی نعمتیں یا قبر کا عذاب جسم اور روح دونوں پر ہوگا، اور یہ بھی عقیدہ ہے کہ قبر کوئی دائمی ٹھکانہ نہیں ہے، بلکہ یہاں سے ایک دوسرے جہان میں منتقل ہونا ہے جو دار الآخرۃ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] صحیح مسلم: ۲۸۶۸

[وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ] [1]

یعنی: اور یہ کہ قیامت قطعاً آنے والی ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ قبروں والوں کو دوبارہ زندہ فرما کر اٹھائے گا۔

نیز فرمایا:

[وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ] [2]

یعنی: اور صور پھونک دیا جائے گا پس آسمانوں اور زمین والے سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر جسے اللہ چاہے، پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا پس وہ ایک دم کھڑے ہو کر دیکھنے لگ جائیں گے۔

نیز فرمایا:

[وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا] [3]

یعنی: اس دن ہم انہیں آپس میں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونک دیا جائے گا پس سب کو اکٹھا کرکے ہم جمع کرلیں گے۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

قیامت کے دن کا حشر، دنیاوی جسم کے ساتھ ہوگا

اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر، ان کے دنیا کے جسم کے ساتھ ہوگا، وہی آنکھیں، کان اور چمڑی ہوگی۔

[1] الحج: ۷

[2] الزمر: ۶۸

[3] [illegible]

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ﴿١٩﴾ حَتَّى إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٠﴾ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۖ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢١﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٢٢﴾ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿٢٣﴾][1]

یعنی: اور جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف لائے جائیں گے اور ان (سب) کو جمع کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جب بالکل جہنم کے پاس آجائیں گے اور ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی۔ یہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی، وہ جواب دیں گی کہ ہمیں اس اللہ نے قوت گویائی عطا فرمائی جس نے ہر چیز کو بولنے کی طاقت بخشی ہے، اسی نے تمہیں اول مرتبہ پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے، اور تم (اپنی بداعمالیاں) اس وجہ سے پوشیدہ رکھتے ہی نہ تھے کہ تم پر تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں گواہی دیں گی، ہاں تم یہ سمجھتے رہے کہ تم جو کچھ بھی کر رہے ہو اس میں سے بہت سے اعمال سے اللہ بے خبر ہے۔ تمہاری اسی بدگمانی نے جو تم نے اپنے رب سے کر رکھی تھی تمہیں ہلاک کر دیا اور بالآخر تم زیاں کاروں میں ہو گئے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

[الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا

---

[1] فصلت:۲۲،۱۹

كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٦٥﴾][1]

یعنی: ہم آج کے دن ان کے منہ پر مہریں لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور ان کے پاؤں گواہیاں دیں گے، ان کاموں کی جو وہ کرتے تھے۔

نیز فرمایا: [يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾][2]

یعنی: جب کہ ان کے مقابلے میں ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔

یہ بات احادیث سے بھی ثابت ہے۔ بطور مثال صحیح بخاری و مسلم میں مروی، حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ پڑھی جائے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کا قصہ ذکر فرمایا ہے جس نے عند الموت اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ اس کے جسم کو مرنے کے بعد جلا دیا جائے، اور اس کی راکھ آدھی سمندر میں بہا دی جائے اور بقیہ آدھی خشکی کی ہواؤں کے سپرد کر دی جائے، بیٹوں نے یہ وصیت من وعن نافذ کر دی، اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا کہ اس بندے کی راکھ نکال باہر کرو، اسی طرح خشکی کو بھی راکھ نکالنے کا حکم دیا، حتی کہ اس شخص کا پورا جسم جیسا کہ دنیا میں تھا، تیار ہو گیا۔[3]

قرآن وحدیث کے ان دلائل سے بخوبی علم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو ان کے دنیوی جسم اور اعضاء کے ساتھ اٹھائے گا، اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک وجہ واللہ اعلم یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اپنا انصاف قائم کرنے کیلئے ہر بندے کے جسم کے ہر عضو سے گواہی لینی ہے، تو کوئی بندہ اپنے کسی عضو کا یہ کہہ کر انکار نہ کر سکے کہ یہ تو میرا عضو ہے ہی نہیں، لہذا اللہ رب العزت دنیوی اعضاء کے ساتھ ہر بندے کا حشر فرمائے گا۔

---

[1] یس:۶۵

[2] نور:۲۴

[3] صحیح بخاری:۶۵۰۶/ صحیح مسلم:۲۷۵۶

قرآن پاک نے تو یہاں تک بتلا دیا ہے کہ ہر انسان کے ہاتھوں کی انگلیوں کے پورے تک، دنیا والے ہونگے، کوئی فرق نہ ہوگا۔

[اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝][1]

یعنی: کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے ہی نہیں۔ ہاں ضرور کریں گے ہم تو قادر ہیں کہ اس کی پور پور تک درست کر دیں۔

ان تمام باتوں پر ایمان لانا، یوم آخرت پر ایمان لانے کا حصہ ہے، جو شخص ان میں سے کسی شی کا انکار کرے گا، وہ یوم آخرت کے انکار کا مرتکب ہوگا، اور جو شخص یوم آخرت کے انکار کا مرتکب ہوگا وہ ایمان کے ساتھ کفر کا مرتکب ہوگا۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

میدانِ محشر اور اس کی خطورت

یوم آخرت پر ایمان لانے کا ایک اہم حصہ یہ بھی ہے کہ قبروں سے لوگوں کو اٹھا کر موقف میں اکٹھا کر دیا جائے گا موقف سے مراد وہ زمین جہاں آخرت کا حشر بپا ہوگا اور تمام خلائق کا حساب وکتاب ہوگا۔

اس حشر کی شدت وخطورت کا اندازہ اس حدیث سے لگایا جا سکتا ہے:

عن عائشة رضي الله عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: (تحشرون حفاة عراة غرلا،قالت عائشة :فقلت يا رسول الله :الرجال والنساء ينظر بعضهم إلى بعض؟فقال:الأمر أشد من أن يهمهم ذلك)[2]

[1] القيامة: ۳،۴

[2] صحیح بخاری: ۱۵۲۷، صحیح مسلم: ۲۸۵۹

یعنی: ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم لوگ اٹھائے جاؤ گے ننگے پاؤں، برہنہ جسم اور ختنہ کے بغیر، اس پر ام المؤمنین نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر تو مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نہیں) معاملہ اس سے بہت زیادہ سنگین ہوگا۔

یہ حدیث صحیح بخاری ومسلم میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

سب سے پہلے محمد ﷺ کو قبر سے اٹھایا جائے گا

ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سب سے پہلے جس شخصیت کی قبر شق ہوگی اور جسے سب سے پہلے ارضِ محشر میں اٹھایا جائے گا، وہ محمد ﷺ ہیں۔

جس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان:

(أنا سيد ولد آدم يوم القيامة ،وأول من ينشق عنه القبر،وأول شافع وأول مشفع)[1]

یعنی: میں قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، اور سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی، اور سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا، اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی۔

آخرت کا یہ حشر کائنات کے ہر شخص پر قائم ہوگا، کوئی شخص اس حشر سے بچ نہ پائے گا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا ۝][2]

یعنی: ہم انہیں قیامت کے دن جمع کریں گے، اور ان میں سے کسی شخص کو نہ چھوڑیں گے۔

[1] صحیح مسلم: ۲۲۷۸

[2] الکہف: ۴۷

شفاعتِ عظمیٰ کا بیان

یومِ آخرت پر ایمان لانے کا ایک اہم ترین حصہ، شفاعتِ عظمیٰ پر ایمان لانا ہے، یہ حساب وکتاب سے قبل ارضِ محشر میں ہوگی، یہ محمد رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے، اور یہی مقامِ محمود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حساب وکتاب کیلئے آنا، اور اس صفت پر ایمان کا طریقہ

اسی شفاعت کے بعد اللہ تعالیٰ حساب وکتاب کیلئے آئے گا، اللہ تعالیٰ کا آنا قرآن مجید میں مذکور ہے:

[وَّجَاۗءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝] [1]

یعنی: اور آئے گا تیرا رب، اور فرشتے صفیں باندھے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی لفصل القضاء بین خلقه. یعنی: اللہ تعالیٰ کا یہ آنا، اپنی مخلوقات میں فیصلے کرنے کیلئے ہے۔

اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت مجئ یعنی: آنا، ثابت ہورہی ہے، جس پر ہمارا ایمان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کے آنے کی کیفیت ہم نہیں جانتے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آنے کی کیفیت بیان نہیں فرمائی، لہذا جو کچھ بتادیا اس پر ایمان لانا فرض ہے، کسی تاویل یا تشبیہ کے بغیر، اور جو نہیں بتایا اس کے علم کو بلاتشبیہ و تاویل، اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا جائے، اس عقیدہ کے ساتھ کہ اس کی ہر صفت، کمال ہے، ہر نقص اور عیب سے پاک ہے۔

شفاعتِ عظمیٰ کی تفصیل

ارضِ محشر کی یہ شفاعت، شفاعتِ عظمیٰ کہلاتی ہے، جو احادیث صحیحہ میں (حدیث شفاعت) کے نام سے مذکور و معروف ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ محشر کے وقوف سے انتہائی پریشان

[1] الفجر: ۲۲

ہونگے، چنانچہ حساب وکتاب کے شروع ہونے اور محشر کے وقوف سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے شافع کی تلاش کریں گے، یکے بعد دیگرے اولوالعزم انبیاء (آدم، ابراھیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام) کے پاس جائیں گے، اور حساب وکتاب کے شروع ہونے کیلئے، اللہ تعالیٰ کے حضور شفاعت کا مطالبہ کریں گے، ہر نبی اپنی ایک غلطی کا ذکر کرکے کہے گا: (لست بصاحب ذاكم) یعنی: یہ میرا کام نہیں ہے۔

بالآخر لوگ سید ولد آدم، افضل الرسل محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر شفاعت کا مطالبہ کریں گے، آپ ﷺ فرمائیں گے: (أنا لها، أنا لها) یعنی: اس (شفاعت) کیلئے میں ہوں، اس (شفاعت) کیلئے میں ہوں۔

آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور، فصلِ قضاء کیلئے آنے کی شفاعت کریں گے، جسے اللہ تعالیٰ قبول کرلے گا، اور حساب وکتاب کیلئے آئے گا، آگے فرشتے قطار اندر قطار چل رہے ہونگے، یہ شفاعتِ عظمیٰ اور مقامِ محمود ہے، اسے مقامِ محمود اس لئے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کے اس مبارک عمل پر تمام اولین وآخرین آپ کی حمد یعنی تعریف بجالائیں گے۔

واضح ہو کہ یہ قیامت کی جملہ شفاعتوں میں سے پہلی شفاعت ہوگی، جو اہلِ موقف کو محشر کی تکلیف سے چھٹکارا دلانے اور حساب وکتاب شروع ہونے کے حوالے سے ہوگی، قیامت کے دن اور بھی بہت سی شفاعتوں کا ذکر ملتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہونگیں، قیامت کے دن نہ تو کوئی اپنی مرضی سے شافع بن سکے گا، اور نہ کوئی شافع اپنی مرضی سے کسی کو مشفوع یعنی قابل شفاعت قرار دے سکے گا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ] [1]

یعنی: کون ہے جو اس کے حضور شفاعت کر سکے، مگر صرف اسی کی اجازت سے۔

نیز فرمایا: [وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى][1]

یعنی: شفاعت کرنے والے نہیں شفاعت کرسکیں گے مگر صرف اس کی جس کی شفاعت میں اللہ تعالی راضی ہوگا۔

دیگر شفاعتوں کی تفصیل

ان شفاعتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

① اہلِ جہنم کیلئے شفاعت: اس سے مراد کچھ وہ لوگ ہیں جن کیلئے جہنم کے داخلے کا فیصلہ ہوگا، رسول اللہ ﷺ اللہ تعالی کے حضور ان کیلئے جہنم سے بچاؤ کی شفاعت فرمائیں گے، احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پل صراط پر تشریف لاکر شفاعت فرمائیں گے۔ اس موقعہ پر آپ ﷺ کے الفاظ یہ ہونگے: (اللهم سلم سلم) اور بعض احادیث میں (رب سلم سلم) یعنی: اے اللہ! انہیں سلامتی عطا فرمادے۔ مکمل حدیث اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے۔

② اہلِ جنت کے رفع درجات کی شفاعت: اس سے مراد یہ ہے کہ کچھ جنتی، جنت میں داخل ہونگے اور ان درجات پر فائز ہونگے، جو ان کے اعمال کے موافق ہونگے، رسول اللہ ﷺ ان کیلئے بلندیٔ درجات کی شفاعت فرمائیں گے۔ اسی میں ازواجِ مطہرات کیلئے شفاعت بھی شامل ہے، یعنی وہ جس درجہ کی مستحق ہونگی اس پر فائز ہونگی، تو رسول اللہ ﷺ ان کیلئے اللہ تعالی کے حضور شفاعت فرمائیں گے کہ انہیں، آپ ﷺ کے ساتھ ملادے۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:

[وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا

[1] الانبیاء:۲۸

اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِی ٔ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۲۱)][1]

یعنی: اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کی پیروی کی ہم ان کی اولاد کو ان تک پہنچا دیں گے اور ان کے عمل سے ہم کچھ کم نہ کریں گے، ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا گروی ہے۔

③ جنت میں بلاحساب داخل کروانے کی شفاعت، جس کی دلیل آپ ﷺ کی وہ دعا ہے جو آپ نے عکاشہ بن محصن الغفاری کیلئے فرمائی تھی، تاکہ وہ ان ستر ہزار افراد میں شامل ہوجائے، جنہیں بلاحساب جنت کا داخلہ نصیب ہوگا۔[2]

④ تخفیفِ عذاب کی شفاعت، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کیلئے عذاب میں نرمی کی شفاعت فرمائیں گے، چنانچہ اللہ تعالی اسے (ضحضاح) میں ڈال دے گا، جہاں آگ صرف دو قدموں کو چھوے گی، مگر اس میں بھی اتنی شدت ہوگی کہ دماغ کھولتا رہے گا۔[3] والعیاذ باللہ۔

⑤ دخول جنت کی شفاعت: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(أنا أول الناس يشفع في الجنة، وأنا أكثر الأنبياء تبعا)[4]

یعنی: میں سب سے پہلے دخول جنت میں شافع ہونگا، اور تمام انبیاء میں میرے پیروکار سب سے زیادہ ہونگے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں:

(آتي باب الجنة يوم القيامة فأستفتح، فيقول الخازن: من أنت؟ فأقول:

[1] طور:۲۱
[2] صحیح بخاری: ۵۸۱۱، صحیح مسلم: ۲۱۶
[3] صحیح بخاری: ۳۸۸۳، صحیح مسلم: ۲۰۹
[4] صحیح مسلم: ۱۹۶

محمد، فیقول: بك أمرت لا أفتح لأحد قبلك)[1]

یعنی: میں جنت کے دروازے پہ آؤنگا اور (دستک دیکر) اس کے کھولے جانے کا تقاضا کرونگا، دربان فرشتہ پوچھے گا: تم کون ہو؟ میں کہوں گا: محمد (ﷺ)، وہ کہے گا: آپ ہی کے بارہ میں مجھے حکم دیا گیا تھا کہ آپ سے قبل کسی کیلئے جنت کا دروازہ نہ کھولوں۔

اہلِ کبائر کیلئے شفاعت

⑥ اہلِ کبائر کیلئے جہنم سے نکالے جانے کی شفاعت:

اس کے اثبات کیلئے بے شمار احادیث موجود ہیں، بعض علماء نے ان کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

(لکل نبی دعوة مستجابة،فتعجل کل نبی دعوته، وإني إختبأت دعوتی شفاعة لأمتي يوم القيامة فهي نائلة إن شاء الله من مات من أمتي لايشرك بالله شيئا)[2]

یعنی: ہر نبی کو ایک ایسی دعا کا اختیار دیا گیا جو ضرور قبول کرلی جائے گی، چنانچہ ہر نبی وہ دعا مانگنے میں جلدی کرگیا (یعنی ہر نبی اس دعا کا حق دنیا میں استعمال کر چکا ہے) میں نے اس دعا کو چھپا کر آخرت میں اپنی امت کی شفاعت کیلئے ذخیرہ بنالیا ہے، پس یہ شفاعت میری امت کے ہر اس شخص کو ان شاء اللہ نصیب ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پر نہ مرا ہو۔

واضح ہو کہ شفاعت کی یہ قسم ملائکہ، انبیاء اور مؤمنین سب کو حاصل ہوگی، صحیح مسلم میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا:

[1] صحیح مسلم:۱۹۷

[2] صحیح بخاری:۶۳۰۴، صحیح مسلم:۱۹۹، واللفظ لمسلم

(شفعت الملائكة وشفع النبيون وشفع المؤمنون ولم يبق إلا أرحم الراحمين ... الحديث)

یعنی: فرشتے شفاعت کر چکے، انبیاء شفاعت کر چکے اور مؤمنین شفاعت کر چکے، اب صرف ارحم الراحمین باقی رہ گیا ہے۔ الحدیث

✪✪✪✪✪✪✪✪✪✪

قیامت کا انتہائی مہیب مرحلہ

قیامت کا ایک انتہائی اہم اور بڑا ہی مہیب مرحلہ، بندوں کی اللہ تعالیٰ پر پیشی کا ہے، اس پیشی میں بندوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے جملہ اعمال کا حساب دینا ہے، آخرت کی اس پیشی پر ایمان لانا ضروری ہے اس کے بغیر ایمان بالیوم الآخر نا قابل قبول ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ﴿١٩﴾ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ﴿٢٥﴾ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ﴿٢٦﴾ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ﴿٢٧﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ﴿٢٨﴾ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ﴿٢٩﴾ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ﴿٣١﴾ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿٣٢﴾][1]

ترجمہ: اس دن تم سب سامنے پیش کیے جاؤ گے، تمہارا کوئی بھید پوشیدہ نہ رہے گا۔ سو جسے اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہنے لگے گا کہ لو میرا نامۂ اعمال پڑھو۔ مجھے تو

[1] الحاقة:۱۸-۳۲

کامل یقین تھا کہ مجھے اپنا حساب ملنا ہے۔پس وہ ایک دل پسند زندگی میں ہوگا۔بلند و بالا جنت میں۔جس کے میوے جھکے پڑے ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کہ مزے سے کھاؤ، پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزشتہ زمانے میں کیے۔لیکن جسے اس (کے اعمال) کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں دی جائے گی، وہ تو کہے گا کہ کاش کہ مجھے میری کتاب دی ہی نہ جاتی، اور میں جانتا ہی نہ کہ حساب کیا ہے۔کاش! کہ موت (میرا) کام ہی تمام کر دیتی، میرے مال نے بھی مجھے کچھ نفع نہ دیا، میرا غلبہ بھی مجھ سے جاتا رہا (حکم ہوگا) اسے پکڑ لو پھر اسے طوق پہنا دو، پھر اسے دوزخ میں ڈال دو۔پھر اسے ایسی زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ کی ہے جکڑ دو۔

نیز فرمایا:

[وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۸] [1]

یعنی: اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے پیش کئے جائیں گے اور سارے گواہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا، خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔

عن عدی بن حاتم رضی الله تعالیٰ عنه قال: قال النبیﷺ: (ما منکم من أحد إلا سیکلمه الله یوم القیامة لیس بینه وبینه ترجمان ثم ینظر فلا یری شیئا قدامه ینظر بین یدیه فتستقبله النار، فمن استطاع منکم أن یتقی النار ولو بشق تمرة) [2]

[1] ھود:۱۸
[2] صحیح بخاری:۶۵۳۹

یعنی: عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص سے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کلام فرمانا ہے (حساب لینا ہے) اس طرح کہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے بیچ میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا، وہ شخص دائیں بائیں جھانکے گا مگر اسے (کوئی حمایتی) نظر نہ آئے گا، اور اس کے سامنے سے جہنم کی آگ استقبال کرے گی، پس اس آگ سے بچنے کیلئے اپنی تمام طاقت صرف کر دو (کچھ نہ ہو) تو آدھی کھجور ہی اس کی راہ میں صدقہ کر دو۔

اس حساب کی شدت اور سنگینی جاننے کیلئے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو پڑھ لیجئے:

عن عائشة رضی الله تعالیٰ عنها أن رسول الله ﷺ قال: (لیس أحد یحاسب یوم القیامة إلا هلك) فقلت یا رسول الله: ألیس قد قال الله تعالیٰ: [فأما من أوتی كتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا] فقال رسول الله ﷺ: (إنما ذلك العرض، ولیس أحد یناقش الحساب یوم القیامة إلا عذب) [1]

یعنی: عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن جس بھی شخص کا حساب لیا جائے گا، وہ ہلاک ہو جائے گا۔میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے: (ترجمہ) "جس شخص کو اس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا اس کا حساب آسان لیا جائے گا۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آسان حساب سے مراد گناہوں کا پیش کیا جانا ہے، لیکن جس شخص سے دوران حساب اس کے گناہوں پر مناقشہ ہو گیا وہ ضرور عذاب دیا جائے گا۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے یوں پوچھ لیا کہ تم نے فلاں گناہ کیوں کیا تھا؟)

○○○○○○○○○○○

[1] صحیح بخاری:۶۵۳۷

حوض کوثر پر ایمان کا بیان

یوم آخرت پر ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حوض پر ایمان لایا جائے۔آپ ﷺ کا حوض متواتر احادیث سے ثابت ہے،امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں کتاب الرقاق کے اندر حوض کا باب قائم فرمایا ہے،اور اس کے اثبات کیلئے انیس اسانید ذکر فرمائی ہیں۔حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ذکر فرمایا ہے کہ حوض کی احادیث پچاس سے زائد صحابہ سے مروی ہیں،ان میں سے پچیس صحابہ کے نام قاضی عیاض کے حوالے سے گنوائے ہیں اور تین امام نووی سے،اور اتنی ہی تعداد کا اپنی تحقیق سے اضافہ کیا ہے،اس طرح پچاس سے زیادہ صحابہ کی فہرست مرتب ہوگئی۔[1]

حافظ ابن کثیر نے کتاب النھایۃ میں تیس سے زائد صحابہ سے حوض کی احادیث نقل فرمائیں ہیں۔[2]

نبی ﷺ کے حوض کے وصف میں چند احادیث پیش خدمت ہیں:

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

(حوضي مسيرة شهر،ماؤه أبيض من اللبن وريحه أطيب من المسك، وكيزانه كنجوم السماء،من شرب منها فلا يظمأ أبدا)[3]

یعنی: میرا حوض ایک ماہ کی مسافت کے بقدر ہے،اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور خوشبو مسک سے زیادہ عمدہ ہے،اس کے آبخورے آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں،جس نے ایک بار اس کا پانی پی لیا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی۔

---
[1] فتح الباری ۱۱/۴۶۹-۴۶۸

[2] ۶۹-۶۵/۲

[3] صحیح بخاری:۶۵۷۹

(صحیح مسلم:۲۲۹۲) میں یہ الفاظ وارد ہیں:

(حوضي مسيرة شهر وزواياه سواء، وماؤه أبيض من الورق، وريحه أطيب من المسك، وكيزانه كنجوم السماء، فمن شرب منه فلا يظمأ بعده أبدا)

یعنی: میرا حوض ایک ماہ کی مسافت کے بقدر ہے،اور اس کے ہر کونے کا فاصلہ برابر ہے، اس کا پانی چاندی سے زیادہ سفید اور اس کی خوشبو مسک سے بڑھ کر عمدہ ہے،اس کے آبخورے آسمان کے ستاروں کے برابر ہیں،جس نے ایک بار اس کا پانی پی لیا اسے اس کے بعد کبھی پیاس نہ لگے گی۔

صحیح مسلم میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں یہ اضافہ بھی مذکور ہے:

(يشخب فيه ميزابان من الجنة)

یعنی: اس حوض میں جنت کے دو بہتے پرنالے گر رہے ہونگے۔

اسی حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں:

(عرضه مثل طوله ما بين عمان إلى أيلة،ماؤه أشد بياضا من اللبن وأحلى من العسل)[1]

یعنی: حوض کا عرض،اس کے طول کے برابر ہوگا،اور عمان سے ایلۃ تک کی مسافت جتنا بڑا ہوگا، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔

میدانِ محشر کی گرمی اور اہل ایمان کیلئے اس سے بچاؤ کا انتظام

میدانِ حشر میں گرمی کا یہ عالم ہوگا کہ سورج ایک میل کے فاصلہ پر کھڑا ہوگا،ٹھنڈک حاصل کرنے کا کوئی انتظام نہ ہوگا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اندرونی اور بیرونی ٹھنڈک کے حصول کیلئے دو انتظام موجود

---
[1] صحیح مسلم:۲۳۰۰

ہونگے: ایک وہ سایہ جو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پیدا فرمائے گا، بعض احادیث میں اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کا ذکر ہے۔

دوسرا انتظام اندرونی ٹھنڈک کے حصول کا ہوگا، یہ رسول اللہ ﷺ کا حوض ہے، جس کا پانی صرف اہل السنۃ یعنی ان لوگوں کو میسر ہوگا جو بدعات سے پوری طرح اجتناب برتتے ہوئے، رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ سے جڑے رہے، جن کا اوڑھنا بچھونا، صرف احادیث رسول ﷺ ہی رہا۔

عن سهل بن سعد رضي الله تعالى عنه قال، قال النبي ﷺ: (إني فرطكم على الحوض، من مر علي شرب، ومن شرب لم يظمأ أبدا، ليردن علي أقوام أعرفهم ويعرفوني، ثم يحال بيني وبينهم)[1]

یعنی: سھل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں حوض کوثر پہ تم سے پہلے پہنچ کر تمہارا انتظار کرونگا، جو اس حوض سے گذرے گا وہ ضرور اس کا پانی پیئے گا، اور جسے حوض کوثر کا پانی نصیب ہوگیا اسے کبھی پیاس نہ لگے گی، کچھ لوگ حوض کوثر پہ وارد ہونگے، جنہیں میں پہچانتا ہونگا اور وہ مجھے پہچانتے ہونگے، پھر میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ حائل کردی جائے گی۔

ابوحازم (اس حدیث کے راوی) فرماتے ہیں: جب مجھ سے نعمان بن ابی عیاش نے یہ حدیث سنی تو پوچھا: کیا تم نے اسی طرح سھل بن سعد سے سنا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، تو انہوں نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اس حدیث پر مزید یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں: (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (جب میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ حائل کردی جائے گی) تو میں کہوں گا: یہ مجھ سے ہیں، تو کہا جائے گا: (انك لا تدري ما أحدثوا بعدك) یعنی: آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں ایجاد کرڈالیں۔ تو میں کہوں گا: (سحقا سحقا لمن غير بعدي) یعنی: جنہوں نے میرے بعد میرے دین کو بدل ڈالا، انہیں مجھ سے دور کردیا جائے۔

[1] صحیح بخاری: ۶۵۸۳

حوضِ کوثر پر اہلِ بدعت کا ہیبت ناک انجام

کچھ لوگوں کو حوضِ کوثر پر وارد ہونے سے روک دیا جائے گا، صحیح بخاری (۶۵۷۶) میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أنا فرطكم على الحوض، وليرفعن رجال منكم، ثم ليختلجن دوني فأقول: يارب أصحابي فيقال: انك لا تدري ما أحدثوا بعدك)

یعنی: میں حوض کوثر پہ تمہارا انتظار واستقبال کرونگا، تم میں سے کچھ لوگ ظاہر کیئے جائیں گے پھر میرے سامنے کھینچ کر نکال دیئے جائیں گے، میں کہوں گا: میرے پروردگار یہ تو میرے ساتھی ہیں، کہا جائے گا: آپ (ﷺ) نہیں جانتے انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا نئے طریقے اپنا لئے تھے۔

ان ساتھیوں سے مراد وہ چند لوگ ہیں، جنہوں نے نبی ﷺ کی وفات کے بعد ارتداد اختیار کرلیا تھا، اور پھر ان اسلامی کامیاب لشکروں کے ہاتھوں قتل کردیئے گئے تھے، جنہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے قتال کیلئے بھیجا تھا (نوٹ: وہ شرعی نصوص جو کسی مخصوص تناظر میں وارد ہوتے ہیں ان کے حکم میں عموم ملحوظ ہوتا ہے، لہذا قیامت کے دن حوضِ کوثر پہ ہر مبتدع کی اسی طرح بے توقیری اور تذلیل ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں مبتدعین کو دیکھ کر یہ کہوں گا: (سحقا سحقا لمن غير بعدي) یعنی: جن لوگوں نے میرے بعد دین کو تبدیل کردیا انہیں میری نظروں سے دور کردیا جائے۔

روافض کی ہذیان گوئی

روافض، جن کے سینے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حقد وبغض سے لبریز ہیں، کا یہ زعمِ باطل ہے کہ صحابہ کرام نبی ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے تھے، بہت تھوڑی تعداد دین پر باقی رہی، ان کے بقول احادیث میں جن لوگوں کو حوض کوثر سے دور کرنے کا ذکر وارد ہے، وہ (نعوذ باللہ) یہی اصحابِ رسول ﷺ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حوض کوثر سے دور ہٹانے کے اصل مستحق خود روافض ہیں؛ کیونکہ وہ وضوء میں اپنے پاؤں نہیں دھوتے، بلکہ مسح کرتے ہیں ،اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:(ويل للأعقاب من النار) یعنی: وضوء میں جن کے پاؤں کی ایڑیاں تھوڑی سی خشک رہ جائیں ان کیلئے جہنم کی ویل ہے۔[1]

اس کے علاوہ روافض کے چہرے اس چمک دمک سے محروم ہیں جو وضوء سے پیدا ہوتی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(ان أمتي يدعون يوم القيامة غرا محجلين من آثار الوضوء)[2]

یعنی: بے شک میری امت قیامت کے دن بلائی جائے گی،ان کی پیشانیاں اور دیگر اعضاء وضوء،وضوء کی برکت سے چمک رہے ہونگے

اس دور کے ایک گمراہ شخص کے صحابہ کرام کے متعلق باطل نظریہ کا رد

واضح ہوکہ اس دور میں ایک شخص پیدا ہوا ہے جس کا زعم ہے کہ وہ اہل السنۃ میں سے ہے، جبکہ اہل السنۃ سے اس کا کوئی واسطہ یا تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ ان روافض کے منہج پر قائم ہے جو اپنے سینوں میں صحابہ کے خلاف بغض وعناد رکھتے ہیں ،اس شخص کا نام حسن بن فرحان المالکی ہے، یہ سعودی عرب کے انتہائی جنوبی علاقہ بنو مالک کی طرف منسوب ہے۔

اس شخص نے ایک انتہائی سخیف اور گھٹیا سا رسالہ تصنیف کیا ہے، جس کا عنوان "الصحابة بين الصُّحْبةِ اللغوية و الصُّحْبةِ الشرعية "ہے(یعنی صحابہ میں لغوی اور شرعی صحبت کا فرق)

اس رسالہ میں اس کا زعم ہے کہ صحابہ صرف وہ مہاجرین وانصار ہیں جو صلح حدیبیہ سے قبل موجود تھے جنہوں نے حدیبیہ کے بعد اسلام قبول کیا یا ہجرت کی ان کیلئے شرعی صحابیت کا کوئی حصہ

[1] صحیح بخاری (۱۶۵) صحیح مسلم (۲۴۲) بروایت ابو ہریرة رضی اللہ عنہ
[2] صحیح بخاری (۱۳۶) بروایت ابو ہریرة رضی اللہ عنہ

نہیں بلکہ ان کی صحبت تو منافقین وکفار کی صحبت جیسی ہے۔

اس شخص نے اپنے اس قول سے بہت سے اصحاب رسول ﷺ کو نبی ﷺ کی صحابیت سے خارج کردیا، جن میں عباس بن عبدالمطلب نبی ﷺ کے چچا،اوران کے بیٹے حبر امت، ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھم بھی ہیں۔اسی طرح ابوموسیٰ اشعری ،ابوھریرۃ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے بے شمار صحابہ کو شرف صحابیت سے فارغ کردیا۔

یہ پندرھویں صدی میں ایک بدعت اور محدث قول ہے،اس مالکی سے قبل یہ بات کسی نے نہیں کہی،سوائے اسی جیسے ایک نوعمر نوجوان کے،جس کا نام عبدالرحمن بن محمد الحکمی ہے۔

اس کی اس گھٹیا کتاب میں صحابہ کرام کی عدالت کا بھی انکار ہے،اس کے خیالِ فاسد کے مطابق اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی ﷺ کے حوض سے دھتکار دیا جائے گا اور نعوذ باللہ واصل جہنم کردیا جائے گا۔

اس کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام میں سے بہت تھوڑی تعداد نجات پاسکے گی، (اس نے اس تھوڑی تعداد کے بیان کیلئے "مثل همل النعم" کی تعبیر استعمال کی ہے،یہ تعبیر ایک حدیث میں وارد ہوئی ہے،جس کا بیان آگے آئے گا،اس تعبیر سے کسی شیٔ کی تعداد کی قلت کا اظہار مقصود ہوتا ہے، "همل النعم" ، ریوڑ کے ان چند اونٹوں کو کہتے ہیں جو چرواہے کے بغیر دن یا رات گزاریں،ایسے اونٹوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔)

اس شخص (مالکی) کے مذکورہ بیانات سے ثابت ہوگیا کہ اس کا تعلق اہل السنۃ سے نہیں بلکہ روافض حاقدین علی اصحاب رسول اللہ ﷺ سے ہے۔میں نے ایک کتاب بعنوان "الانتصار للصحابة الاخيار في رد اباطيل حسن المالكي" لکھی ہے،جس میں اس کی تمام اباطیل وخرافات کا رد کیا ہے۔

اس کتاب میں، میں نے حوض سے دور ہٹائے جانے کے تعلق سے لکھا ہے:

مالکی نے جو عدالتِ صحابہ کا انکار کیا ہے، اس کے رد کی ساتویں وجہ یہ ہے کہ مالکی اپنی کتاب کے صفحہ ۶۳ میں لکھتا ہے کہ "صحابہ کرام کی مذمتِ عام میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جس میں صحابہ کے ایک جمِ غفیر کو جہنم کی طرف جاتا دیکھ کر نبی ﷺ فرمائیں گے: یہ تو میرے صحابی ہیں، یہ تو میرے صحابی ہیں۔ کہا جائے گا: آپ (ﷺ) نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ (ﷺ) کے بعد کیا کیا نئے طریقے اپنالئے۔ یہ بخاری ومسلم کی حدیث ہے، جبکہ صحیح بخاری میں (بقولِ مالکی) یہ الفاظ بھی وارد ہیں: (فلا أری ینجو منکم إلا مثل همل النعم) یعنی تم میں سے بہت تھوڑے لوگ "مثل همل النعم" نجات پاسکیں گے۔"

اب اس مخالف ومعاند کا کہنا ہے کہ صحابہ کیلئے کیا امتیاز باقی رہ گیا جبکہ نبی ﷺ نے فرمادیا کہ ان میں سے بہت تھوڑے لوگ نجات پاسکیں گے، باقی تمام جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے (والعیاذ باللہ) اس حاقد اور معاند نے یہی بات اپنی کتاب کے صفحہ ۶۴ میں دہرائی ہے۔

ہم اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں: صحیح بخاری، کتاب الرقاق کی جس حدیث کا اس نے حوالہ دیا ہے، وہ ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یوں ہیں (۶۵۸۷):

(بينا أنا نائم فإذا زمرة، حتى إذا عرفتهم خرج رجل من بيني وبينهم فقال:هلم، فقلت :أين ؟ قال: إلى النار والله! قلت: وماشأنهم ؟قال إنهم ارتدوا بعدك على أدبارهم القهقرى، ثم إذا زمرة ،حتى إذا عرفتهم خرج رجل من بيني وبينهم ،فقال: هلم ،قلت :أين ؟قال :إلى النار والله! قلت: ماشأنهم ؟ قال: إنهم ارتدوا بعدك على أدبارهم القهقرى، فلا أراه يخلص منهم إلا مثل همل النعم)

یعنی: ایک بار میں سورہا تھا کہ میں نے ایک جماعت دیکھی جب میں ان کو پہچان چکا تو میرے اوران کے درمیان سے ایک شخص نکلا، اس نے کہا: ادھر آؤ، میں نے پوچھا: کہاں؟ اس

نے کہا: جہنم کی طرف اللہ کی قسم، میں نے پوچھا: ان کا کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا: انہوں نے آپ کے بعد اپنی پشتوں کے بل پھر کر ارتداد اختیار کرلیا تھا۔ پھر ایک جماعت ظاہر ہوئی، جب میں انہیں پہچان چکا تو ایک آدمی میرے اوران کے درمیان سے برآمد ہوا، اس نے کہا: آؤ، میں نے کہا: کس طرف؟ اس نے کہا: جہنم کی طرف اللہ کی قسم، میں نے پوچھا: ان کا کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا: انہوں نے آپ (ﷺ) کے بعد اپنی پشتوں کے بل پھر کر ارتداد اختیار کیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کچھ لوگ بچ کر (حوض تک پہنچ سکیں)، مگر اتنی سی تعداد میں جتنی تعداد میں بن چرواہے رات یا دن گزارنے والے اونٹ ہوتے ہیں۔

حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نبی ﷺ کا فرمان: (بين أنا نائم) اکثر نسخوں میں اسی طرح وارد ہوا ہے، جبکہ کشمیھنی کے نسخہ میں "نائم" بالنون کی بجائے "قائم" بالقاف ہے، اور یہ روایت زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ قیام سے مراد قیامت کے دن حوض پہ کھڑا ہونا ہے، اگر "نائم" لیا جائے تو وہ بھی درست ہے، اس سے مراد یہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے دنیا میں خواب میں قیامت کے دن (حوض پہ کھڑا ہونے کا) وہ منظر دیکھا (جس کا آپ ﷺ نے حدیث مذکور میں ذکر فرمایا ہے)

حافظ ابن حجر نے حدیث کے آخری حصہ (فلا أراه يخلص منهم إلا مثل همل النعم) کا مطلب بیان فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حوضِ کوثر پہ وارد ہونے کیلئے قریب آئیں گے تو انہیں روک دیا جائے گا۔ (حافظ ابن حجر مزید فرماتے ہیں) مطلب یہ ہے کہ ان میں سے حوضِ کوثر پر وارد ہونے والے بہت تھوڑے لوگ ہونگے؛ کیونکہ اونٹوں میں سے بن چرواہے اونٹ بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔

گویا مذکورہ حدیث میں وارد الفاظ "فلا أراه يخلص منهم إلا مثل همل النعم" کا مطلب یہ ہے کہ حدیث مذکور میں جن دو جماعتوں کے حوض پر وارد ہونے کا ذکر ہے، ان میں سے

بہت تھوڑے لوگ حوض پہ وارد ہوسکیں گے، حدیث مذکور سے کہیں یہ ثابت نہیں ہو رہا کہ آپ ﷺ پر آپ کے صحابہ کی صرف یہی دو جماعتیں پیش ہونگی۔

مالکی نے جب حدیث مذکور کو بیان کیا تو اس میں ایک غلط لفظ ڈال دیا، اور اسی غلط لفظ کی بنیاد پر صحابہ کرام پر ایک غلط حکم عام قائم کردیا، چنانچہ اس کا کہنا ہے کہ صحیح بخاری میں یوں بھی مروی ہے "فلا أری ینجو منکم إلا مثل همل النعم"۔ اس نے "منکم" مخاطب کے لفظ کے ساتھ حدیث بیان کی حالانکہ حدیث میں "منهم" ہے، پھر اس نے اپنے غلط لفظ "منکم" کی بنیاد پر یہ بات کہہ دی کہ صحابہ کیلئے کیا امتیاز باقی رہ گیا جبکہ نبی ﷺ نے فرمادیا کہ ان میں سے بہت تھوڑے لوگ نجات پاسکیں گے، باقی تمام جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔

(والعیاذ باللہ)

نیز یہ کہہ دیا کہ نبی ﷺ نے خبر دی ہے کہ قیامت کے دن آپ ﷺ کے صحابہ میں سے بہت کم لوگ "مثل همل النعم" نجات پاسکیں گے۔

اس نے یہ بات کہہ کر نبی ﷺ پر جھوٹ باندھا ہے؛ کیونکہ نبی ﷺ نے یہ خبر نہیں دی کہ صحابہ کرام میں سے بہت کم نجات پاسکیں گے۔ (بلکہ نبی ﷺ کی حدیث کا ملخص یہ ہے کہ قیامت کے دن جو دو جماعتیں حوض پر وارد ہونے کیلئے آئیں گی، چونکہ ان میں سے اکثر نے ارتداد اختیار کرلیا تھا لہٰذا ان میں سے اکثر کو حوض سے روک لیا جائے گا اور بہت کم حوض پر وارد ہونگے، گویا اس حدیث میں صحابہ کرام کا ذکر نہیں بلکہ ان تھوڑے سے لوگوں کا ذکر ہے، جنہوں نے نبی ﷺ کے دور میں اسلام قبول تو کرلیا لیکن آپ ﷺ کے فوت ہوتے ہی ارتداد اختیار کرلیا۔

ہوسکتا ہے مالکی کی مذکورہ بات عمداً نہ ہو بلکہ بر بنائے خطأ ہو۔ (واللہ اعلم)

بعض احادیث میں جو یہ بات وارد ہوئی ہے، کہ آپ ﷺ کے حوض سے آپ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کو دور کردیا جائے گا، اور آپ ﷺ اصحابی یا اصیحابی کہیں گے، آپ ﷺ

کو جواب ملے گا کہ آپ (ﷺ) نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ (ﷺ) کے بعد کیا کیا نئی چیزیں اپنالی تھیں۔ تو اس سے مراد وہ تھوڑے سے لوگ ہیں جو نبی ﷺ کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے تھے، امیر المؤمنین سیدنا ابوبکر صدیق ص نے ان مرتدین سے قتال کیلئے اپنے لشکر روانہ کئے، جو ان مرتدین کو قتل کرکے کامیاب وکامران واپس لوٹ آئے۔

میں کہتا ہوں: اگر اس شخص (مالکی) کے زعم میں اکثر اصحابِ رسول ﷺ کا انجام جہنم کی آگ ہے اور بہت کم نجات پاسکیں گے، تو پھر یہ مالکی اپنے لئے کس قسم کا انجام سوچے بیٹھا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت اور سلامتی کا سوال کرتے ہیں اور ہر قسم کی ذلت وخذلان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔

اس شخص (مالکی) کا زعم ہے کہ شرعی صحبت صرف ان مہاجرین وانصار صحابہ کرام کو حاصل ہے جو صلح حدیبیہ سے قبل موجود تھے، صلح حدیبیہ کے بعد آنے والے اس کے زعم فاسد کے مطابق صحابہ کے زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔

اب اس کا یہ قول کہ صحابہ میں سے بہت تھوڑے نجات پائیں گے، بقیہ سب جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے، اس کا اطلاق انہیں انصار ومہاجرین صحابہ پر ہوگا جو حدیبیہ سے قبل آئے، (کیونکہ وہ انہی کو صحابی مانتا ہے) تو یہ صحابہ جو اس امت کا سب سے بہترین طبقہ ہے، اگر جہنم سے نہیں بچ سکتے تو پھر امت کا وہ کون سا فرد ہے تو جہنم سے بچ سکے گا۔

یہود ونصاریٰ بھی موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کے بارہ میں وہ بات نہیں کہہ سکے جو یہ مالکی کہہ گیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شخص قبح وفساد اور شر کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہے، جو شخص بھی اس کی یہ بات سنے گا یا بذات خود پڑھے گا تو وہ یا تو اسے مفقود العقل سمجھے گا یا اسے پرلے درجے کا خبیث اور صحابہ کرام جو امت کی سب سے افضل جماعت ہے پر حاقد قرار دے گا، خاص طور پہ اس کا یہ کہنا کہ عباس بن عبد المطلب اوران کا بیٹا عبد اللہ صحابی نہیں تھے، اور خاص طور پہ اس کا یہ کہنا کہ اکثر

صحابہ (تھوڑی تعداد کے علاوہ) جہنم میں جائیں گے۔

پھر اگر اس شخص کے زعم کے مطابق، اکثر صحابہ (علاوہ بعض کے) جہنمی ہیں، تو کتاب وسنت تو ہم تک صحابہ کرام کے طریق ہی سے پہنچا ہے، وہی رسول اللہ ﷺ اور بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان واسطہ ہیں، تو پھر لوگوں کے پاس کون سا حق اور کون سی ہدایت ہے؛ کیونکہ ناقل میں قدح اور جرح منقول میں قدح اور جرح کے مترادف ہے۔

امام ابوزرعۃ الرازی (المتوفی: ۲۶۴) فرماتے ہیں:

"اذا رأيت الرجل ينتقص أحدا من أصحاب رسول الله ﷺ فاعلم أنه زنديق وذلك أن رسول الله ﷺ عندنا حق والقرآن حق، وإنما أدى إلينا هذا القرآن والسنن أصحاب رسول الله ﷺ وإنما يريدون أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة، والجرح بهم أولى وهم زنادقة" [1]

ترجمہ: جب تم کسی شخص کو اصحابِ رسول ﷺ پر جرح کرتے ہوئے دیکھو تو یقین کرلو کہ وہ زندیق ہے؛ کیونکہ ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ حق ہیں، اور قرآن بھی حق ہے، ہماری طرف قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث پہنچانے والے رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، یہ زنادقہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ان گواہوں (صحابہ کرام) پر جرح کرکے کتاب وسنت کو باطل کردیں، حالانکہ یہ خود جرح وقدح کے مستحق ہیں اور زندیق ہیں۔

○○○○○○

وزنِ اعمال پر ایمان کا بیان

یوم آخرت پر ایمان کیلئے ضروری ہے کہ وزنِ اعمال پر ایمان لایا جائے، چنانچہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ رب العزت قیامت کے دن اپنا عدل قائم کرنے کیلئے بندوں کے اعمال تولے گا، اس

[1] الكفاية للخطيب البغدادي: ص ۴۹

مقصد کیلئے ایک میزان یعنی ترازو نصب فرمائے گا، جس میں وزن ظاہر کرنے کیلئے لسان یعنی کانٹا لگا ہوگا، اس میزان کے دو پلڑے ہونگے، جن میں اعمال کے ثقل کی بناء پر جھکاؤ کی صلاحیت ہوگی، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں میزان کا ذکر فرمایا ہے:

[وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۭ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝۴۷] [1]

یعنی: قیامت کے دن ہم درمیان میں لارکھیں گے ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو کو۔ پھر کسی پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا۔ اور اگر ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا ہم اسے لا حاضر کریں گے، اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

میزان کی عظمت وہیبت کا اندازہ، سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے قول سے لگایا جاسکتا ہے، اس قسم کا قول مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے، چنانچہ امام لالکائی رحمہ اللہ اپنی کتاب السنۃ میں فرماتے ہیں:

عن سلمان قال: (يوضع الميزان وله كفتان لو وضع في احداهما السموات والأرض ومن فيهن لوسعته) [2]

یعنی: میزان رکھا جائے گا، اس کے دو پلڑے ہونگے، اگر ایک پلڑے میں ساتوں آسمان اور زمینیں اور جو کچھ ان میں موجود ہے رکھے جائیں تو اس میں سما جائیں۔

قرآن مجید نے میزان کی خبر کے ساتھ ساتھ، وزن یعنی تولے جانے کی بھی خبر دی ہے:

[وَالْوَزْنُ يَوْمَىِٕذِۨ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۸ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝۹] [3]

[1] الانبياء: ۴۷
[2] فتح الباری ۱۳/۶۲۰
[3] الاعراف: ۸، ۹

یعنی: اور اس روز وزن بھی برحق ہے پھر جس شخص کا پلا بھاری ہوگا سو ایسے لوگ کامیاب ہوں گے اور جس شخص کا پلا ہلکا ہوگا سو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔

نیز فرمایا:

[فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ﴿۱۰۱﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿۱۰۲﴾ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِیْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ﴿۱۰۳﴾][1]

یعنی: پس جب کہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن نہ تو آپس کے رشتے داریاں رہیں گے، نہ آپس کی پوچھ گچھ جن کی ترازو کا پلہ بھاری ہوگیا وہ تو نجات والے ہوگئے اور جن کے ترازو کا پلہ ہلکا ہوگیا یہ ہیں وہ جنہوں نے اپنا نقصان آپ کرلیا جو ہمیشہ کے لئے جہنم واصل ہوئے۔

نیز فرمایا:

[فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ﴿۶﴾ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِیَةٌ﴿۹﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِیَهْ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِیَةٌ﴿۱۱﴾][2]

یعنی: پھر جس کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ تو دل پسند آرام کی زندگی میں ہوگا اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے تجھے کیا معلوم کہ وہ کیا ہے وہ تند و تیز آگ ہے۔

امام لالکائی رحمہ اللہ اپنی کتاب السنۃ میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی ایک موقوف روایت لائے ہیں کہ صاحب المیزان، جبریل علیہ السلام ہونگے۔[3]

[1] المؤمنون:۱۰۳-۱۰۱
[2] القارعۃ:۱۱-۶
[3] فتح الباری:۲۶۱/۱۳

وزنِ اعمال کی باریک بینی

اعمال کا وزن اتنی باریک بینی سے ہوگا کہ نیکیوں اور بدیوں کے درمیان ایک رائی کے دانے کا فرق بھی سامنے آجائے گا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کتاب الفوائد للخیثمہ کے حوالے سے جابر رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے:

(توضع الموازین یوم القیامة فتوزن الحسنات والسیئات فمن رجحت حسناته علی سیئاته مثقال حبة دخل الجنة ومن رجحت سیئاته علی حسناته مثقال حبة دخل النار)[1]

یعنی: قیامت کے دن میزان نصب کیا جائے گا، پھر نیکیوں اور گناہوں کو تولا جائے گا، پس جس شخص کی نیکیاں، اس کے گناہوں سے ایک رائی کے دانے کے بقدر بڑھ گئیں وہ جنت میں داخل ہوگا، اور جس شخص کے گناہ، اس کی نیکیوں سے ایک رائی کے دانے کے بقدر بڑھ گئے وہ جہنم میں داخل ہوجائے گا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس قسم کا ایک قول بحوالہ کتاب الزھد لا بن المبارک، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفا مروی ہے۔ (ایضا)

وزنِ اعمال کے متعلق متکلمین کے شبہات کا رد

واضح ہو کہ اعمال خواہ نیک ہوں یا بد، اجسام نہیں بلکہ اعراض ہیں، جن کا ہمارے لئے وزن کرنا ناممکن ہے، مگر اللہ تعالی نے قیامت کے دن اپنے میزان میں اعمال کو تولنے کی خبر دی ہے، جس پر ہمارا کامل ایمان وایقان ہے، ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت اعمال کو

[1] فتح الباری:۲۶۱/۱۳

باوجودیکہ وہ اعراض ہیں اور جسم نہیں رکھتے، وزن کرنے پر قادر ہے۔

[وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿٤٥﴾] [1]

متکلمین ضالین اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بندوں کی قدرت پر قیاس کرتے ہوئے وزنِ اعمال، اور بنابریں میزان کا انکار کر بیٹھے، جوکہ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار ہے بلکہ قیامت کا بھی انکار ہے، کیونکہ قیامت پر ایمان صرف اس شخص کا معتبر وقابل قبول ہے جو قیامت کے حوالے سے شریعت کی بیان کردہ تمام خبروں کو سچا جانتے ہوئے ایمان لائے۔

وزنِ اعمال کی مختلف صورتیں

احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے میزان میں اعمال کا وزن تین طرح سے فرمائے گا، ہمارا وزن کی ان تینوں صورتوں پر کسی تاویل کے بغیر ایمان ہے:

① اعمال کا وزن۔

② اعمال کے صحائف کا وزن۔

③ صاحب عمل انسانوں کا وزن۔

اعمال کو تولنے کی دلیل:

① عن ابی الدرداء رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: (ما یوضع فی المیزان یوم القیامة أثقل من خلق حسن) [2]

یعنی: ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن، اللہ تعالیٰ کی میزان میں اچھے اخلاق سے بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی۔

[1] الکھف: ۴۵

[2] ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان، بحوالہ فتح الباری: ۶۶۱/۱۳، امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے

صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان مروی ہے:

(الطھور شطر الایمان والحمدللہ تملأ المیزان وسبحان اللہ والحمدللہ تملآن أو تملأ ما بین السماوات والأرض) [1]

یعنی: پاکیزگی نصف ایمان ہے، اور (الحمدللہ) میزان کو بھر دے گا، اور (سبحان اللہ والحمدللہ) دونوں آسمان وزمین کے مابین کو بھر دیتے ہیں۔

صحیح بخاری کی آخری حدیث بھی اس کی دلیل ہے:

عن ابی ھریرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی ﷺ قال: (کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان: سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم) [2]

یعنی: دو کلمے، جو اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں، زبان پر ہلکے ہیں اور میزان میں بہت بھاری ہوں گے: (سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم)

② جہاں تک اعمال کے صحیفوں کے تولے جانے کا تعلق ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے: (توزن صحائف الاعمال) یعنی: اعمال کے صحیفے تولے جائیں گے۔

حدیث البطاقة کے نام سے معروف حدیث بھی اس کی دلیل بن سکتی ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(ان اللہ سیخلص رجلا من أمتی علی رؤوس الخلائق یوم القیامة، فینشر علیه تسعة وتسعین سجلا، کل سجل مثل مد البصر، ثم یقول: أتنکر من ھذا

[1] صحیح مسلم: ۲۲۳

[2] صحیح بخاری: ۷۵۶۳، صحیح مسلم: ۲۶۹۴

شيئاً؟ أظلمك كتبتي الحافظون؟ فيقول: لا يا رب! فيقول: أفلك عذر؟ فيقول: لا يا رب! فيقول :بلى، إن لك عندنا حسنة، فإنه لا ظلم عليك اليوم. فتخرج بطاقة فيها: أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبدالله ورسوله. فيقول: احضر وزنك. فيقول: يا رب! ما هذه البطاقة أمام السجلات؟ فقال: إنك لا تظلم .قال: فتوضع السجلات في كفة والبطاقة في كفة، فطاشت السجلات وثقلت البطاقة، فلا يثقل مع اسم الله شيء)[1]

یعنی: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام خلائق کے سامنے، میری امت کے ایک شخص کو لائے گا اور اس پر (اس کے گناہوں کے) ننانوے رجسٹر کھول دے گا، ہر رجسٹر کا طول وعرض تاحد نگاہ ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تم ان میں سے اپنے کسی گناہ کا انکار کرتے ہو؟ کیا میرے کراما کاتبین نے کسی گناہ کے تحریر کرنے پر، تم پر کوئی ظلم کیا ہے؟ وہ کہے گا: نہیں یارب۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہارے پاس تمہارے کسی گناہ کا کوئی عذر ہے؟ وہ کہے گا: نہیں یارب۔

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: (میرے بندے) میرے پاس تیری ایک نیکی ہے، آج تجھ پر کوئی ظلم نہ ہوگا، چنانچہ ایک بطاقہ یعنی چھوٹی سی پرچی نکالی جائے گی، جس پر (أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبدالله ورسوله) لکھا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اپنے وزن کا خود مشاہدہ کر۔

وہ کہے گا: بھلا یہ چھوٹی سی پرچی، اتنے سارے رجسٹروں کا کیا مقابلہ کرے گی؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بلاشبہ تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا، چنانچہ وہ (ننانوے) رجسٹر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور پرچی دوسرے میں۔

[1] أخرجه الترمذي: ٢٦٣٩ وحسنه ،والحاكم (١/٦) وصححه على شرط مسلم، ووافقه الذهبي، وانظر: السلسلة الصحيحة للألباني: ١٣٥

رجسٹروں والا پلڑا اوپر کو اٹھ جائے گا اور پرچی والا پلڑا انتہائی وزنی اور بوجھل ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کے نام سے کوئی چیز بھاری نہیں۔

③ جہاں تک صاحب عمل یعنی انسان کے تولے جانے کا تعلق ہے تو یہ بھی بعض احادیث سے ثابت ہے، رسول اللہ ﷺ نے کافر بندے کے ذکر میں فرمایا ہے: (لا يزن عند الله جناح بعوضة) یعنی: وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کا بھی وزن نہیں رکھتا۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی پنڈلیوں کے بارہ میں فرمایا تھا:

(والذي نفسي بيده لهما أثقل في الميزان من أحد)[1]

یعنی: مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، عبداللہ کی دونوں پنڈلیاں، اللہ تعالیٰ کے میزان میں احد پہاڑ سے بھی بھاری ہونگی۔

واضح ہو کہ وزن اعمال کا مقصد، اعمال کا معیار ظاہر کرنا ہے، جہاں تک اعمال کے شمار کا تعلق ہے تو وہ وزن اعمال کے مرحلے سے قبل کئی طریقوں سے ہو چکا ہوگا۔

نیکیوں کا معیار

نیکیوں کا معیار دو چیزوں کے ساتھ ثابت ہوگا: ایک اخلاص اور دوسری رسول اللہ ﷺ کی سنت کی متابعت۔

اخلاص کے شرط ہونے کی دلیل:

[وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ حُنَفَاۗءَ .....الآية][2]

یعنی: انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے

[1] مسند احمد: ٣٩٩١

[2] البينة: ٥

دین کو خالص رکھیں۔

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

(إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى ....الحديث)

یعنی: تمام اعمال کی صحت و قبولیت، نیت کے ساتھ ہے اور ہر شخص کو اس کے عمل سے وہی کچھ ملے گا جو وہ نیت کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت کی متابعت بھی ہر عمل کی صحت و قبولیت کیلئے شرط ہے، قال اللہ تعالیٰ: [يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۝۳۳] [1]

یعنی: اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور مت برباد کرو اپنے اعمال کو۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد) [2]

یعنی: جو بھی شخص کوئی ایسا عمل کرے جس پر ہمارا امر موجود نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

قیامت کے دن انہی دونوں معیاروں کو دیکھنے اور پرکھنے کیلئے تمام اعمال کو ترازو میں ڈالا جائے گا، اور ترازو صرف اسی عمل کو وزن کے قابل قرار دے گا جو مذکورہ معیار کے مطابق ہونگے۔ لہذا ایسے عمل کا کوئی وزن نہ ہوگا جو اخلاص سے خالی ہو، اور نہ ہی وہ عمل کسی وزن کے قابل ہوگا جو رسول اللہ ﷺ کی سنت کی متابعت سے خالی ہو۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] محمد: ۳۳

[2] صحیح مسلم

پل صراط پر ایمان کا بیان

یوم آخرت پر ایمان کیلئے ضروری ہے کہ پل صراط پر ایمان لایا جائے، یہ پل جہنم کے اوپر نصب ہوگا، جسے اہلِ ایمان جنت تک پہنچنے کیلئے استعمال کریں گے، چونکہ یہ پل جنت تک رسائی کیلئے واحد راستہ ہوگا لہٰذا اس کے اوپر سے گذرنا اور اسے عبور کرنا ضروری ہوگا، بصورتِ دیگر نیچے دہکتی ہوئی جہنم کا لقمہ بننا پڑے گا، یہ انتہائی مشکل مرحلہ ہوگا؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی احادیث کے مطابق اس پل کی باریکی بال سے زیادہ اور کاٹ تلوار سے زیادہ ہوگی، مستدرک حاکم میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان منقول ہے:

(ويوضع الصراط مثل حد الموسى، فتقول الملائكة: من تجيز عليه هذا؟ فيقول :من شئت من خلقي. فيقولون: سبحانك ما عبدناك حق العبادة) [1]

یعنی: پل صراط کو رکھا جائے گا، وہ استرے (بلیڈ) کی دھار جیسا باریک ہوگا، فرشتے اسے دیکھ کر پوچھیں گے: یا اللہ! اس پل کو بھلا کون عبور کرسکے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بہت سے بندے جنہیں میں چاہوں گا، فرشتے کہیں گے: تو پاک ہے، ہم تو تیری عبادت کا حق ادا نہیں کرسکے۔ (یعنی فرشتے اس پل کی انتہائی باریک اور طویل دھار کو دیکھ کر اس پر چلنا محال سمجھیں گے، چہ جائیکہ اسے کوئی عبور کرسکے، جب فرشتوں کو بتایا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندے اسے عبور کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، تو فرشتے اپنی صدیوں کی عبادت کو حقیر قرار دیتے ہوئے کہیں گے کہ ہم تو تیری عبادت کا حق ادا نہیں کرسکے، جو لوگ اسے عبور کرنے میں کامیاب ہونگے درحقیقت وہی تیری عبادت کا حق ادا کرپائے ہیں۔)

اس مرحلہ کے آغاز سے قبل انبیاء و مرسلین کیلئے شفاعت حلال ہوجائے گی۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

[1] بحوالہ سلسلة الاحاديث الصحيحة للألباني: ۲/۶۵۶

ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے، جس میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

(فيضرب الصراط بين ظهراني جهنم. فأكون أول من يجوز من الرسل بأمته. ولا يتكلم يومئذ أحد إلا الرسل، وكلام الرسل يومئذ: اللهم سلم سلم. وفي جهنم كلاليب مثل شوك السعدان، هل رأيتم شوك السعدان؟ قالوا: نعم. قال: فإنها مثل الشوك السعدان، غير أنه لا يعلم قدر عظمها إلا الله تخطف الناس بأعمالهم. فمنهم من يوبق بعمله، ومنهم من يُخردل ثم ينجو)[1]

یعنی: جہنم کے اوپر درمیان میں ایک پل نصب کیا جائے گا، تمام رسولوں میں، میں سب سے پہلے اپنی امت کو لیکر اسے عبور کرونگا، اس موقعہ پر رسولوں کے علاوہ کوئی بات نہ کرسکے گا اور رسولوں کی بات بھی اسی قدر ہوگی کہ وہ (اللھم سلم سلم) کہیں گے، یعنی اے اللہ سلامتی عطا فرما دے۔ اور پل صراط کے اردگرد، سعدان بوٹی کے کانٹوں کی مانند کنڈے ہونگے، کیا تم نے سعدان بوٹی کے کانٹے دیکھے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں، آپ ﷺ نے فرمایا: وہ کنڈے سعدان کے کانٹوں کی طرح کثیر تعداد میں ہونگے، البتہ وہ سائز میں کتنے بڑے ہونگے، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو نہیں۔

یہ کنڈے لوگوں کو ان کے گناہوں کے بقدر اچکیں اور نوچے گے، کچھ بدعمل تو برباد ہوکر جہنم کا لقمہ بن جائیں گے اور کچھ کو نوچ نوچ کر رائی کے دانے کے برابر کردیا جائے گا، پھر بالآخر وہ نجات پاجائے گا۔

صحیح مسلم میں ابوھریرہ رضی اللہ عنہ اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہیں:

(وترسل الأمانة والرحم، فتقومان جنبتي الصراط يمينا وشمالا، ويمر

[1] صحیح بخاری: ۸۰۶، صحیح مسلم: ۲۹۹

أولكم كالبرق. قال: قلت: بأبي أنت وأمي! أي شيئ كمر البرق؟ قال: أولم تروا إلى البرق كيف يمر ويرجع في طرفة عين؟ ثم كمر الريح، ثم كمر الطير وشد الرجال، تجري بهم أعمالهم، ونبيكم قائم على الصراط يقول: سلم سلم! حتى تعجز أعمال العباد، حتى يجيئ الرجل فلا يستطيع السير إلا زحفا. قال وفي حافتي الصراط كلاليب معلقة، مأمورة بأخذ من أمرت به، فمخدوش ناج، ومكدوس في النار)[1]

یعنی: امانت اور رشتہ داری کو چھوڑ دیا جائے گا، یہ دونوں پل صراط کے دائیں بائیں کھڑی ہوجائیں گی، تمہاری پہلی جماعت بجلی کی طرح اس پل کو عبور کرجائے گی، میں نے عرض کیا: میرے ماں باپ قربان، بجلی کی طرح عبور کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں کہ بجلی کس طرح ٹوٹتی ہے اور پھر پلک جھپکتے واپس لوٹ جاتی ہے، پھر کچھ لوگ تیز رفتار آندھی کی طرح گذریں گے، پھر کچھ لوگ پرندے کی اُڑان کی طرح گذرجائیں گے، یہ تیزی ان کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوگی، تمہارا نبی پل صراط پر کھڑا ہوگا اور (رب سلم سلم) اے اللہ! سلامتی عطا فرمادے، کہہ رہا ہوگا، حتی کہ ایسے بندے بھی آجائیں گے جن کی نیکیاں انتہائی عاجز اور قاصر ہونگی، یہ لوگ اپنے قدموں پر چلنے کی طاقت نہیں رکھیں گے، بلکہ بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل چل رہے ہونگے، پل کے دونوں اطراف نوک دار کنڈے معلق ہونگے، جوگذرنے والوں کو پکڑنے پر مأمور ہونگے، بالآخر کچھ تو زخموں سے چور نجات پاجائیں گے اور کچھ اوندھے منہ جہنم میں گرجائیں گے۔

صحیح مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں:

(ثم يضرب الجسر على جهنم وتحل الشفاعة، ويقولون: اللهم سلم سلم.

[1] صحیح مسلم: ۳۲۹

قیل: یا رسول اللہ !وما الجسر؟ قال دحض مزلة، فیه خطاطیف وکلالیب وحسك، تکون بنجد فیها شویکة یقال لها السعدان، فیمر المؤمنون کطرف العین، وکالبرق، وکالریح، وکالطیر، وکأجاوید الخیل والرکاب، فناج مسلم، ومخدوش مرسل، ومکدوس فی نار جهنم)[1]

یعنی: پھر جہنم پر پل نصب کیا جائے گا، اور شفاعت حلال ہو جائے گی، اور انبیاء (اللهم سلم سلم) کہہ رہے ہونگے، کسی نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ یہ پل کیا ہے؟ فرمایا: پھسلنے والی جگہ، جس کے اطراف میں لوہے کے نوک دار کنڈے ہونگے، نیز پیچ دار جھاڑیاں ہونگی، جیسا کہ تم نے نجد کی سرزمین میں کانٹوں سے بھری سعدان نامی بوٹی دیکھی ہوگی، مؤمن تو پلک جھپکنے کی مانند گذر جائیں گے، کچھ بجلی کی طرح، کچھ ہوا کی طرح، کچھ پرندے کی رفتار کی طرح، اور کچھ عمدہ نسل کے گھوڑوں اور اونٹوں کی طرح۔ اس پل سے گذرنے والے کچھ لوگ تو بلکل صحیح سالم گذر جائیں گے، کچھ بری طرح زخمی کر کے چھوڑ دیے جائیں گے، اور کچھ اوندھے منہ جہنم میں گرا دیئے جائیں گے۔

○○○○○○○○○

جنت اور جہنم پر ایمان کا بیان

یوم آخرت پر ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ جنت اور جہنم پر بھی ایمان لایا جائے، یہ بھی مانا جائے کہ یہ دونوں اس وقت موجود ہیں، نیز یہ کہ یہ ہمیشہ قائم اور باقی رہیں گی۔

جنت اللہ تعالی کے اولیاء کا جبکہ جہنم اللہ تعالی کے اعداء کا ٹھکانہ ہے، چنانچہ جنت کے بارہ میں قرآن پاک میں ہے:

[وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا

[1] صحیح مسلم:۳۰۲

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ] [1]

یعنی: اور جو مہاجرین اور انصار سابق اور مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے راضی ہوئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے یہ بڑی کامیابی ہے۔

نیز فرمایا:

[وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ] [2]

یعنی: اور اپنے رب کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

نیز فرمایا:

[سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ] [3]

یعنی: (آؤ) دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے یہ ان کے لیے بنائی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

[1] التوبة:۱۰۰
[2] آل عمران:۱۳۳
[3] الحدید:۲۱

جہنم اور اہل جہنم کے بارہ میں چند آیات ملاحظہ ہو:

[وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۗنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝] [1]

یعنی: اور تاکہ ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرکہ عورتوں کو عذاب دے جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانیاں رکھنے والے ہیں، (دراصل) انہیں پر برائی کا پھیرا ہے، اللہ ان پر ناراض ہوا اور انہیں لعنت کی اور ان کے لئے دوزخ تیار کی اور وہ (بہت) بری لوٹنے کی جگہ ہے۔

نیز فرمایا: [وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝] [2]

اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

نیز فرمایا:

[فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝] [3]

یعنی: اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

جنت اور جہنم اس وقت بھی موجود ہیں

جنت اور جہنم کے ان نصوص سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جنت اور جہنم اس وقت بھی موجود ہیں، یہی اہل السنۃ کا عقیدہ ہے، اس بارہ میں بطور دلیل ایک حدیث ملاحظہ ہو:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے سورج گرہن کی نماز کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جب رسول اللہ ﷺ نماز کسوف سے فارغ ہوئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول

[1] الفتح: ٦
[2] آل عمران: ١٣١
[3] البقرۃ: ٢٤

اللہ ﷺ ہم نے دوران نماز دیکھا کہ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے کوئی چیز پکڑی ہے، اور پھر ہم نے دیکھا کہ آپ تھوڑا سے پیچھے کی جانب ہٹے ہیں، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(إني رأيت الجنة والنار فتناولت عنقوداً، ولو أصبته لأكلتم منه ما بقيت الدنيا، وأريت النار فلم أر منظرا كاليوم قط أفظع، ورأيت أكثر أهلها النساء... الحديث) [1]

یعنی: میں نے جنت کو دیکھا تھا، چنانچہ اس کا ایک خوشہ پکڑلیا، اگر میں وہ لے آتا تو تم، جب تک دنیا قائم رہتی، اس میں سے کھاتے رہتے۔ اور مجھے جہنم بھی دکھائی گئی، آج تک اس سے بڑھ کر ہولناک منظر میں نے نہیں دیکھا، اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ جہنم میں عورتیں زیادہ ہیں۔

گمراہ فرقہ معتزلہ، جنت اور جہنم کے اس وقت موجود ہونے کا انکاری ہے، ان کا کہنا ہے کہ یہ دونوں قیامت کے دن پیدا کی جائیں گی؛ کیونکہ قیامت سے قبل ان کا پیدا کیا جانا عبث ہے، ان کے بقول یہ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ ایک مدتِ مدیدہ سے جنت موجود ہے مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جارہا، اور جہنم موجود ہے مگر اس سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا جارہا۔

معتزلہ کا یہ قول ان کی ردی عقل کی اختراع ہے، اور ظاہر البطلان ہے، امت کے اجماع کے خلاف ہے، کتاب وسنت کے نصوص، جن میں سے کچھ کا ذکر ہوا، کے خلاف ہے۔

جنت اور جہنم دونوں کا اس وقت موجود ہونا عبث نہیں بلکہ بہت بڑی حکمت ہے، جنت کا وجود ترغیب اور تشویق، جبکہ جہنم کا وجود تحذیر اور تخویف کا باعث ہے، اور نصوص سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اس وقت بھی جنت سے انتفاع اور جہنم سے ضرر رسانی کا سلسلہ قائم ہے، عذابِ قبر اور نعیم قبر کے ذکر میں بہت کچھ بیان ہو چکا ہے۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂❂

[1] صحیح بخاری: [illegible]، صحیح مسلم: [illegible]

جنت اور جہنم ہمیشہ باقی رہیں گی

اہل السنہ والجماعۃ کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جنت اور جہنم ہمیشہ باقی رہیں گی اور کبھی بھی فناء کا شکار نہیں ہونگیں۔

جنت کے دوام وخلود کیلئے چند قرآنی آیات ملاحظہ ہوں:

[وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵][1]

یعنی: اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان جنتوں کی خوشخبریاں دو، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب کبھی وہ پھلوں کا رزق دیئے جائیں گے اور ہم شکل لائے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے دیئے گئے تھے اور ان کے لئے بیویاں ہیں صاف ستھری اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

نیز فرمایا:

[اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝۱۰۷ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝۱۰۸][2]

یعنی: جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے کام بھی اچھے کیے یقیناً ان کے لئے الفردوس کے باغات کی مہمانی ہے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہا کریں گے جس جگہ کو بدلنے کا کبھی بھی ان کا ارادہ ہی نہ ہوگا۔

نیز فرمایا:

[وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰي سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۷ لَا

[1] البقرة:۲۵
[2] الکہف:۱۰۸،۱۰۷

يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝۴۸][1]

یعنی: ان کے دلوں میں جو کچھ رنجش وکینہ تھا، ہم سب کچھ نکال دیں گے، وہ بھائی بھائی بنے ہوئے ایک دوسرے کے آمنے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے نہ تو وہاں انہیں کوئی تکلیف چھو سکتی ہے اور نہ وہ وہاں سے کبھی نکالے جائیں گے۔

نیز فرمایا:

[اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸][2]

یعنی: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے یہ لوگ بہترین خلائق ہیں ان کا بدلہ ان کے رب کے پاس ہمیشگی والی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور یہ اس سے راضی ہوئے۔ یہ ہے اس کے لئے جو اپنے پروردگار سے ڈرے۔

اسی طرح جہنم کے دوام وبقاء نیز کفار کے خلود فی النار کے سلسلہ میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

[وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ][3]

یعنی: اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

نیز فرمایا:

[وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ][4]

[1] الحجر:۴۸،۴۷
[2] البینۃ:۸،۷
[3] البقرۃ:۳۹
[4] البقرۃ:۱۶۷

یعنی: یہ ہرگز جہنم سے نہ نکلیں گے۔

نیز فرمایا:

[يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ][1]

یعنی: یہ چاہیں گے کہ دوزخ میں سے نکل جائیں لیکن یہ ہرگز اس میں سے نہ نکل سکیں گے، ان کے لئے تو دوامی عذاب ہیں۔

نیز فرمایا:

[فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾][2]

یعنی: پس انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہ دے گی۔

نیز فرمایا:

[وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ][3]

یعنی: اور جو لوگ کافر ہیں ان کے لئے دوزخ کی آگ ہے نہ تو ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ہر کافر کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

نیز فرمایا:

[إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾][4]

---

[1] المائدۃ:۳۷
[2] المدثر:۴۸
[3] الفاطر
[4] النساء:۱۶۹،۱۶۸

یعنی: جن لوگوں نے کفر کیا اور ظلم کیا، انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز ہرگز نہ بخشے گا اور نہ انہیں کوئی راہ دکھائے گا بجز جہنم کی راہ کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے، اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔

نیز فرمایا:

[وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا][1]

یعنی: (اب) جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔

نیز فرمایا:

[إِنَّ اللَّهَ لَعَنَ الْكَافِرِينَ وَأَعَدَّ لَهُمْ سَعِيرًا ﴿٦٤﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ لَّا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿٦٥﴾][2]

یعنی: اللہ تعالیٰ نے کافروں پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہ کوئی حامی و مددگار نہ پائیں گے

نیز فرمایا:

[إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿٦﴾][3]

یعنی: بیشک جو لوگ اہل کتاب میں کافر ہوئے اور مشرکین سب دوزخ کی آگ میں (جائیں گے) جہاں وہ ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں۔

---

[1] الجن:۲۳
[2] الاحزاب:۶۵،۶۴
[3] البینۃ:۶

جنت اور جہنم کے دوام وبقاء کے متعلق شبہات کا رد

کچھ لوگوں کے ذہنوں میں جنت اور جہنم کے دوام وبقاء کے تعلق سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ دوام وبقاء تو صرف اللہ رب العزت کیلئے ہے؟ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کیلئے دوام وبقاء کا عقیدہ رکھنا، اس چیز کو اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں شریک کرنے کے موجب ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ گو جنت اور جہنم ہمیشہ موجود رہیں گی، مگر ان کی ہمیشگی، اللہ تعالیٰ کی ہمیشگی کے مشابہ نہیں ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ موجود رہنا اور کبھی فناء نہ ہونا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا دوام وبقاء، اس کی ذات کیلئے لازم ہے، جبکہ جنت اور جہنم کا بقاء اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں دوام وبقاء عطا نہ فرماتا تو وہ بھی فناء ہو جاتیں، لہذا ان کا اصل بھی فناء پر قائم ہے، مگر انہیں فناء حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دوام عطا فرما دیا ہے۔

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

اہل ایمان کا دیدارِ الٰہی برحق ہے

یومِ آخرت پر ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ ہم دارِ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا حق ہونا قبول کریں، اللہ تعالیٰ کی یہ رؤیت صرف مؤمنین یعنی اہل جنت کو حاصل ہوگی، بلکہ اللہ رب العزت کے دیدار کی نعمت، آخرت کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دیدار کا حق ہونا، قرآن، حدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے، قرآن پاک سے چند دلائل ملاحظہ ہوں:

[وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝][1]

یعنی: اس دن بہت سے چہرے تر وتازہ ہونگے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھنے والے ہونگے۔

[1] القیامۃ: ۲۳،۲۲

نیز فرمایا:

[كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝][1]

یعنی: ہرگز نہیں یہ (مجرم) اس دن اپنے رب سے چھپا دیئے جائیں گے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب یہ مجرم جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگیوں کے متحمل ہونگے، اللہ تعالیٰ سے محجوب ہونگے، تو پھر جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کر چکے ہوں گے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف ومتمتع ہونگے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

[لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ][2]

یعنی: اچھے عمل کرنے والوں کیلئے حسنیٰ ہے اور زیادہ ہے۔

یہاں (الحسنی) سے مراد جنت ہے اور (زیادۃ) سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرے کا دیدار ہے۔ یہ تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا دخل أهل الجنة الجنة. قال: يقول الله تبارك وتعالى: تريدون شيئا أزيدكم؟ فيقولون: ألم تبيض وجوهنا؟ ألم تدخلنا الجنة وتنجنا من النار؟ قال: فيكشف الحجاب. فما أعطوا شيئا أحب إليهم من النظر إلى ربهم عزوجل، ثم تلا هذه الآية: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ[1]

یعنی: جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا: تمہیں مزید کچھ چاہئے؟ وہ کہیں گے: کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں فرما دیئے؟ کیا تو نے ہمیں

[1] المطففین: ۱۵

[2] یونس: ۲۶

جنت کا داخلہ اور جہنم سے چھٹکارہ عطا نہیں فرمادیا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنا حجاب ہٹادے گا، پس ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دیدار سے زیادہ محبوب کوئی چیز عطا نہ ہوگی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: [لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۔]

دیدارِ الٰہی کے متعلق شبہات اور ان کا رد

کچھ لوگوں کے ذہنوں میں قرآن مجید کی ایک آیت سے شبہ پیدا ہوتا ہے، جو ان کے اپنے فہم کی غلطی کی بناء پر ہے، وہ آیت یہ ہے:

[لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ][1]

یعنی: لوگوں کی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں، اور وہ تمام آنکھوں کا ادراک کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی نفی نہیں ہے، بلکہ رؤیت ثابت ہے، جس چیز کی نفی ہے وہ ادراک واحاطہ ہے، چنانچہ اس ذاتِ برحق کی رؤیت تو حق ہے مگر کوئی آنکھ اس کا مکمل احاطہ نہیں کرسکتی، جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم تو حاصل ہے مگر باعتبارِ علم مکمل احاطہ ممکن نہیں ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں جس رؤیت کی نفی ہے وہ دنیا کے اندر ہے، چنانچہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہلِ جنت کو وہ بصارت عطا فرمائے گا جس کے ساتھ ان کیلئے اسے دیکھنا ممکن ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا موسیٰ علیہ السلام سے (لن ترانی) کہنا، یعنی تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، اس سے مراد دنیا کے اندر دیکھنا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(تعلموا أنه لا يرى أحد منكم ربه عزوجل حتى يموت)[2]

یعنی: تم یہ جان لو! تم میں سے کوئی شخص اپنے رب کو نہیں دیکھ سکے گا، حتی کہ مرجائے۔ (یعنی قیامت کے دن)

---

[1] الانعام: ۱۰۳
[2] صحیح مسلم: ۲۹۳۱۵

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب (حادی الأرواح) میں اللہ تعالیٰ کے قیامت کے دن دیدار کے تعلق سے، ستائیس صحابہ کرام کی روایات نقل فرمائی ہیں، اس کے بعد صحابہ کرام اور تابعین عظام اور ان کے بعد آنے والے بہت سے ائمہ اہل السنۃ کے آثار نقل فرمائے ہیں، جو کہ اس مسئلہ پر اجماع کی دلیل ہیں۔

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

ایمان کا چھٹا رکن: تقدیر پر ایمان

ایمان کا چھٹا رکن (وبالقدر خیرہ وشرہ) تقدیر پر ایمان لانا ہے، خواہ وہ خیر ہو یا شر۔

قرآنِ حکیم سے بہت سی آیات، اور رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث تقدیر کے اثبات پر دال ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾][1]

ترجمہ: بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک مقررہ اندازے پر پیدا کیا ہے۔

[قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ][2]

ترجمہ: آپ کہہ دیجئے! ہمیں ہر گز کوئی چیز نہیں پہنچ سکتی مگر وہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔

[مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٢٢﴾][3]

ترجمہ: نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

[1] القمر: ۴۹
[2] التوبۃ: ۵۱
[3] الحدید: ۲۲

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے تو امام بخاری اور امام مسلم (رحمہما اللہ) دونوں نے اپنی اپنی کتاب میں تقدیر کا مستقل باب قائم کیا ہے۔

چنانچہ صحیح مسلم (۲۶۶۴) میں ابو هریرة رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(المؤمن القوی خیر واحب الی اللہ من المؤمن الضعیف وفی کل خیر احرص علی ماینفعك واستعن باللہ ولا تعجز وان اصابك شئ فلا تقل: لو أنی فعلت كذا كان كذا وكذا ولكن قل: قدر اللہ وماشاء فعل. فان لو تفتح عمل الشيطان)

ترجمہ: طاقتور مؤمن، اللہ تعالیٰ کو کمزور مؤمن سے زیادہ بھلا اور محبوب ہے، ویسے دونوں میں بھلائی اور بہتری ہے۔ تم اپنے لئے ہر نفع بخش چیز کی حرص اور تمنا رکھو اور اس کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو، اور عاجز نہ بنو۔ اور اگر کوئی تکلیف پہنچے تو یوں مت کہو کہ اگر میں اس طرح کرلیتا تو اس طرح ہوجاتا۔ بلکہ یوں کہو: اللہ تعالیٰ کا یہی منظور و مقدور تھا، اور جو کچھ اس نے چاہا وہی کیا۔ ''لو'' یعنی اگر اگر کہنا شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

امام مسلم نے اپنی صحیح میں (۲۶۵۵) اپنی سند سے طاؤس (تابعی) کے حوالے سے بیان کیا ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے بہت سے صحابہ کو یہ کہتے ہوئے پایا: ہر چیز تقدیر کے ساتھ ہے۔ مزید فرماتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے سنا: وہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(کل شئ بقدر حتی العجز والکیس)

یعنی ہر چیز حتی کہ عجز اور کیس بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے ساتھ ہے۔

عجز اور کیس آپس میں دو متضاد لفظ ہیں، کیس سے مراد عقلمندی، ہوشیاری اور محنت وغیرہ، اور عجز سے مراد عاجزی، سستی اور کاہلی ہے۔ یہ سب تقدیر کے ساتھ مربوط و منسلک ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: عاجز کا عجز وضعف اور کیس یعنی دانا کی دانائی اور عقلمندی سب تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔[1]

[1] ۱۶/۲۰۵

رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے:

(ما منكم من أحد وقد كتب مقعده من الجنة ومقعده من النار فقالوا: یارسول اللہ ﷺ افلا نتکل؟ فقال: اعملوا فکل میسر ،ثم قرأ: [فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى﴿۵﴾ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى﴿۶﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى﴿۸﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى﴿۹﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى﴿۱۰﴾] [1]

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص کا جنت یا جہنم کا ٹھکانہ لکھا جاچکا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنے لکھے ہوئے پر بھروسہ نہ کرلیں؟ (اور عمل چھوڑ دیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عمل کرو، کیونکہ انسان کا جوٹھکانہ لکھا گیا ہے اس کیلئے اسکے عمل میں آسانی پیدا کردی گئی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل آیت تلاوت فرمائی: ترجمہ: ”جس نے دیا (اللہ کی راہ میں) اور ڈرا (اپنے رب سے)۔ اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا، تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی سہولت دینگے لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پرواہی برتی۔ اور نیک بات کی تکذیب کی، تو ہم بھی اس کی تنگی ومشکل کا سامان میسر کردینگے۔ [2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندوں کا نیک اعمال کرنا تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، اور یہ بھی کے وہ نیک اعمال حصولِ سعادت کا سبب ہیں اور سعادت کا حصول بھی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے۔ اس طرح بعض بندوں کا بُرے اعمال کا ارتکاب کرنا بھی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، اور وہ بُرے اعمال، حصولِ شقاوت (بدبختی) کا سبب ہیں، نیز شقاوت کا حصول بھی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسباب اور انکے مسببات، تمام چیزیں مقدر فرمادی ہیں۔ لہذا کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے فیصلہ، تقدیر، خلق اور ایجاد سے باہر نہیں ہے۔

---

[1] اللیل: ۱۰-۵

[2] صحیح بخاری: ۴۹۴۵، صحیح مسلم: ۲۶۴۷

کوئی چیز تقدیر سے باہر نہیں (ایک عظیم حدیث)

وعن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قال كنت خلف رسول اللہ ﷺ یوما فقال: (یاغلام ! إني اعلمك كلمات: احفظ الله يحفظك. احفظ الله تجده تجاهك، اذا سألت فاسأل الله واذا استعنت فاستعن بالله، واعلم ان الامة لو اجتمعت على ان ينفعوك بشئ لم ينفعوك الا بشئ قد كتبه الله لك ولو اجتمعوا على ان يضروك بشئ لم يضروك الا بشئ قد كتبه الله عليك، رفعت الاقلام وجفت الصحف)

ترجمہ: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں: ایک دن میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا، آپ نے فرمایا: اے لڑکے! میں تجھے چند اہم امور کی تعلیم دیتا ہوں، تم اللہ تعالیٰ کے حدود وفرائض کی حفاظت کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ تم اللہ تعالیٰ کی حدود وفرائض کی حفاظت کرو، ہمیشہ اسے اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب بھی مانگو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور جب بھی مدد طلب کرو صرف اللہ تعالیٰ سے کرو، اور اچھی طرح جان لو! اگر پوری امت تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہے تو اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے نفع کے علاوہ کوئی نفع نہیں پہنچ سکتی۔ اور اگر پوری امت تمہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کے لکھے ہوئے نقصان کے علاوہ کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتی۔ (تقدیر لکھنے والی) قلمیں اٹھالی گئی ہیں اور صحیفے (جن پر تقدیر لکھی گئی ہے) خشک ہوچکے ہیں۔

اس حدیث کی حافظ ابن رجب نے اپنی کتاب "جامع العلوم الحکم فی شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم" (۱/۴۵۹) میں بڑی نفیس شرح فرمائی ہے۔ الاربعون النوویۃ کی یہ حدیث نمبر ۱۹ ہے۔

مراتبِ قدر: علم، کتابت، ارادہ اور خلق وایجاد

واضح ہو کہ تقدیر پر ایمان لانے کے چار مراتب ہیں، ان چاروں مراتب کا اعتقاد رکھنا ضروری ہے۔

☆ پہلا مرتبہ یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہونے والا ہے، سب کا اللہ تعالیٰ کو ازلی علم حاصل ہے، اور یہ بات ناممکن ہے کہ کسی چیز کا اللہ تعالیٰ کو ازلی علم حاصل نہ ہو بلکہ بعد میں علم ہوا ہو۔

☆ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ جس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے:

(کتب اللہ مقادیر الخلائق قبل ان یخلق اللہ السموات والارض بخمسین الف سنة قال: وعرشه علی الماء)[1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل تمام خلائق کی تقدیر لکھ دیں۔ فرمایا: اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔

☆ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومشیئت پر ایمان لایا جائے۔ یعنی اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے ہو رہا ہے، اور چونکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی ملک ہے لہذا اللہ تعالیٰ کی ملک میں وہی کچھ ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ ارادہ فرمالے۔ پس جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے گا وہی کچھ ہوگا، اور جو کچھ نہیں چاہے گا وہ ہرگز نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٨٢﴾][2]

ترجمہ: وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرمادینا (کافی) ہے کہ ہوجا، وہ اسی وقت ہوجاتا ہے۔

---

[1] رواہ مسلم ۲۶۵۳، عن ابن عمر

[2] یسین: ۸۲

نیز فرمایا:

[وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٢٩﴾][1]

ترجمہ: اور تم بغیر پروردگار عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

☆ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے یا ہونے والا ہے سب اللہ تعالیٰ کی خلق وایجاد ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے اس علمِ سابق (ازلی علم) کے مطابق عمل میں آتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل لوحِ محفوظ میں لکھ دیا تھا، لہذا ہر ہر ذات، اور ہر ہر فعل صرف اللہ تعالیٰ کی خلق وایجاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ][2]

ترجمہ: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔

نیز فرمایا:

[وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾][3]

ترجمہ: حالانکہ تمہیں اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔

ایمان بالقدر کا تعلق ایمان بالغیب سے ہے۔۔۔

اللہ تعالیٰ نے تقدیر میں جو فیصلے فرمادیئے اور انہیں لوحِ محفوظ میں تحریر فرمادیا وہ سب کا سب علمِ غیب ہے، جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ البتہ مخلوق کو تقدیر کے فیصلوں کا علم درج ذیل دوصورتوں میں سے کسی ایک صورت کے ساتھ ہوسکتا ہے:

---

[1] التکویر: ۲۹

[2] الزمر: ۶۲

[3] الصافات: ۹۶

(۱) کسی چیز یا کام کے رونما ہونے سے۔ چنانچہ جب بھی کوئی چیز رونما ہوگی معلوم ہو جائے گا کہ یہی امر مقدور ہے، کیونکہ اگر یہ امر مقدور نہ ہوتی تو ہرگز رونما نہ ہوتی، کیونکہ جو اللہ چاہتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے، اور جس چیز کا ہونا اللہ تعالیٰ نہ چاہے وہ ہرگز نہیں ہو سکتی۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مستقبل میں رونما ہونے والے کسی واقعہ یا امر کی خبر دے دیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے ظہورِ دجال، خروجِ یاجوج وماجوج اور نزولِ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی خبر دی۔ اس کے علاوہ اور بھی آپ ﷺ نے بہت سے امور کی خبر دی جو آخری دور میں ظاہر ہونگے۔ ان تمام امور وواقعات کی خبر چونکہ الصادق المصدوق محمد رسول اللہ ﷺ نے دی، لہٰذا ان کا حاصل ہونا لازمی ہے۔ اور چونکہ ان تمام امور کا رونما ہونا ایک طے شدہ حقیقت ہے لہٰذا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور قضاء وقدر کے عین مطابق ہے۔ (لہٰذا ہمارا یہ ایمان ہے کہ قربِ قیامت رونما ہونے والے یہ تمام واقعات برحق ہیں کیونکہ یہ سب رسول اللہ ﷺ کی احادیث سے ثابت ہیں۔ نیز یہ کہ ان تمام امور وواقعات کا اللہ تعالیٰ نے روزِ اول سے فیصلہ فرما کر تقدیر میں لکھ دیا تھا)

ہم مزید ایک مثال سے اس مسئلہ کو واضح کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے واقعہ کی خبر دی جس کا ظہور آپ ﷺ کے زمانے کے بالکل قریب تھا، چنانچہ ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ کبھی لوگوں کو دیکھتے اور کبھی حسن کو، پھر فرمایا:

(ابنی ھذا سید ولعل اللہ یصلح بہ بین فئتین من المسلمین)[1]

یعنی میرا یہ بیٹا سردار ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کی دو جماعتوں کے بیچ صلح کرائے گا۔

[1] بخاری: ۳۷۴۶

رسول اللہ ﷺ کی یہ خبر ۴۱ھ میں حرف بحرف پوری ہوئی، چنانچہ اس سال مسلمانوں کی جمعیت متحد اور مجتمع ہوگئی، حتی کہ اس سال کو "عام الجماعۃ" کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ کے اس فرمان سے یہ نکتہ اخذ کر لیا کہ حسن رضی اللہ عنہ بچپن میں فوت نہیں ہونگے بلکہ اتنی دیر تک ضرور زندہ رہینگے کہ صلح کے تعلق سے آپ ﷺ نے جو پیش گوئی فرمائی وہ پوری ہو جائے، اور کیونکہ یہ سب کچھ رونما ہوا لہٰذا یہی امر مقدور تھا۔ جس کا صحابہ کرام کو قبل از وقوع (بوجہ فرمان رسول اللہ ﷺ) علم ہو گیا۔

اس عالمِ ہستی میں جو بھی خیر وشر ہے سب اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ہے

قولہ: " والایمان بالقدر خیرہ وشرہ حلوہ ومرہ وکل ذلک قد قدر اللہ ربنا "

" یعنی اچھی اور بری، میٹھی اور کڑوی ہر تقدیر پر ایمان لانا (فرض) ہے، اور یہ کہ ان تمام چیزوں کو ہمارے پروردگار اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمایا ہے"

تقدیر کے حوالے سے یہ مسئلہ حدیث جبریل میں مذکور ہے:

(وان تؤمن بالقدر خیرہ وشرہ)

یعنی: تم تقدیر پر ایمان لاؤ خواہ وہ خیر ہو یا شر۔

ہر چیز کا خالق اور مقدر، اللہ رب العزت ہی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ][1]

ترجمہ: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔

تو اس عالم ہستی میں جو بھی خیر وشر ہے، سب اللہ تعالیٰ کے قضاء وقدر، اور مشیئت وارادہ سے ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

(یہاں ایک اشکال وارد کیا جاسکتا ہے کہ) جناب علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں رسول

[1] الزمر: ۶۲

اللہ ﷺ کی ایک طویل دعا مذکور ہے، جس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

(والخير كله في يديك والشر ليس إليك)[1]

یعنی: اے اللہ! تمام کی تمام خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے، جبکہ شر تیری طرف نہیں ہے۔ (تو حدیث بظاہر حدیث جبریل کے مضمون کے متعارض ہے، جس میں خیر وشر کا اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہونے کا ذکر ہے)

(ہم عرض کرتے ہیں کہ) حدیث علی رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان: "شر تیری طرف نہیں ہے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شر اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے واقع نہیں ہوتا، اس فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شر کو محض برائے شر پیدا نہیں فرمایا کہ وہ کسی حکمت سے خالی ہو، یا اس میں کسی وجہ سے کسی قسم کا کوئی فائدہ مرتب نہ ہوتا ہو۔

دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شر کو علی وجہ الاستقلال اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کیا جائے، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات ومقدرات کے عموم کے ضمن میں شامل تصور کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان:

[اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ][2]

یعنی: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ (تو اس کے عموم میں خیر بھی شامل ہے اور شر بھی)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان:

[اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹][3]

ترجمہ: ہم نے ہر شئی ایک معین مقدار سے پیدا فرمائی۔ (یہاں بھی (ہر شئی) کے عموم میں خیر وشر دونوں کو داخل تصور کیا جائے گا)

[1] صحیح مسلم: ۷۷۱
[2] الزمر: ۶۲
[3] القمر: ۴۹

مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ادب کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جنوں کی گفتگو ذکر فرمائی، وہ گفتگو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ادب کی بہترین مثال ہے، چنانچہ انہوں نے خیر کی نسبت بصیغہ معروف اللہ تعالیٰ کی طرف کی لیکن شر کا ذکر بصیغہ مجہول کیا، ملاحظہ ہو:

[وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰][1]

ترجمہ: ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب کا ارادہ ان کے ساتھ بھلائی کا ہے۔

لفظ ارادہ معنیٔ کونی وقدری کے ساتھ ساتھ معنیٔ دینی وشرعی دونوں کیلئے مستعمل ہے

تقدیر کے چار مراتب، جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر ہوا، میں ایک مرتبہ یہ تھا کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیئت وارادہ سے ہے۔ مشیئت وارادہ میں فرق یہ ہے کہ لفظ مشیئت قرآن وحدیث میں صرف معنیٔ کونی وقدری کیلئے وارد ہوا ہے، جبکہ لفظ ارادہ معنیٔ کونی وقدری کے ساتھ ساتھ معنیٔ دینی وشرعی دونوں کیلئے مستعمل ہے۔

چنانچہ ارادہ کے معنیٔ کونی وقدری کیلئے استعمال ہونے کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ][2]

ترجمہ: تمہیں میری خیر خواہی کچھ بھی نفع نہیں دے سکتی، گو میں کتنی ہی تمہاری خیر خواہی کیوں نہ چاہوں، اگر اللہ کا ارادہ تمہیں گمراہ کرنے کا ہو۔

[1] الجن: ۱۰
[2] ہود: ۳۴

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان:

[فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا][1]

ترجمہ: سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستہ پر ڈالنے کا ارادہ فرمالے اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کشادہ کردیتا ہے اور جس کو بے راہ رکھنے کا ارادہ فرمالے اس کے سینہ کو بہت تنگ کردیتا ہے۔

(ان آیات میں اغواء وتضلیل کا ارادہ، ارادۂ کونی وقدری ہے)

لفظ ارادہ کے دینی وشرعی معنی میں وارد ہونے کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

[يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ][2]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے، سختی کا نہیں۔

[مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝][3]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی ڈالنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا ارادہ تمہیں پاک کرنے کا ہے اور تمہیں اپنی بھرپور نعمت دینے کا ہے، تاکہ تم شکر ادا کرتے رہو۔

ارادۂ کونی اور ارادۂ شرعی میں فرق

ارادۂ کونی وقدری اور ارادۂ دینی وشرعی کے درمیان فرق یہ ہے کہ ارادۂ کونیہ عام ہے اور ہر قسم کے امر کیلئے وارد ہوتا ہے، خواہ وہ امر اللہ تعالیٰ کی رضاء اور محبت کو موجب ہو یا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور ناپسندیدگی کو موجب ہو، جبکہ ارادۂ شرعیہ صرف اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پسندیدہ امور کیلئے مختص ہے۔

[1] الانعام:۱۲۵
[2] البقرۃ:۱۸۵
[3] المائدۃ:۶

دوسرا فرق یہ ہے کہ ارادۂ کونیہ کا واقع اور رونما ہونا ضروری ہے، جبکہ ارادۂ شرعیہ اس شخص کے حق میں حاصل ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کی توفیق میسر ہو، اور اس شخص کو حاصل نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے محروم ہو۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جو کونی اور شرعی دونوں معنی دیتے ہیں، مثلاً: القضاء، التحریم، الاذن، الامر، الکلمات وغیرہ۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی مایہ ناز تالیف "شفاء العلیل" کے (۲۹) ویں باب میں ان الفاظ کیلئے قرآن وحدیث سے بہت سی مثالیں ذکر فرمائی ہیں۔

لوح محفوظ کا لکھا ہوا بلا تغیر وتبدل رونما ہوکر رہے گا

اللہ تعالیٰ نے جن امور کے فیصلے فرمالئے اور انہیں لوحِ محفوظ میں لکھ دیا وہ بلا تغیر وتبدل رونما ہوکر رہیں گے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝][1]

ترجمہ: نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں، مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(رفعت الاقلام وجفت الصحف)

یعنی تقدیر لکھ کر قلم اٹھالئے گئے اور صحیفے خشک ہیں۔ (لہذا وہی کچھ ہوگا جو قلموں نے صحیفوں پر لکھ دیا ہے)

[1] الحدید:۲۲

(لیکن درج ذیل آیت اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلے تبدیل بھی فرمالیتا ہے) ملاحظہ ہو:

[يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝۳۹][1]

ترجمہ: اللہ جو چاہے مٹادے اور جو چاہے ثابت رکھے، لوح محفوظ اسی کے پاس ہے۔

آیتِ کریمہ [يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۖ] کا معنی

لیکن اس آیت کو مفسرین نے شرعی امور سے متعلق قرار دیا ہے، یعنی (اللہ تعالیٰ جس نے ہر نبی پر شرعی احکام نازل فرمائے، اسے پورا اختیار ہے کہ) جس حکم کو چاہے منسوخ فرمادے، اور جسے چاہے برقرار رکھے، اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا اور بالآخر محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات پر اختتام پذیر ہوا جس نے سابقہ تمام شرائع کو منسوخ کردیا۔ کچھ مفسرین نے اس سے مراد وہ اقدار لی ہیں جو لوحِ محفوظ میں نہیں ہیں جیسا کہ بعض امور ملائکہ کو تفویض کئے گئے ہیں۔ تفصیل کیلئے حافظ ابن القیم کی کتاب "شفاء العلیل" باب ۲، ۳، ۴، ۵ اور ۶ ملاحظہ ہو۔ حافظ ابن القیم نے ان ابواب میں سے ہر باب میں لوحِ محفوظ کی تقدیر کے بعد خاص تقدیر کا ذکر کیا ہے۔

ایک حدیث (دعاء تقدیر کو بدل دیتی ہے۔۔۔) کی وضاحت

یہاں ایک حدیث کی وضاحت بھی ضروری ہے جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے بسند حسن روایت کیا ہے (۲۱۳۹)، شیخ البانی کی "السلسلۃ الصحیحۃ" (۱۵۴) میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لا یرد القضاء إلا الدعاء، ولا یزید فی العمر الا البر)
یعنی: قضاء کو صرف دعا ٹال سکتی ہے، جبکہ صرف نیکی سے عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔

---

[1] الرعد: ۳۹

حدیث شریف (لا یرد القضاء إلا الدعاء) کا معنی

اس حدیث کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ دعا لوحِ محفوظ کے فیصلے کو بدل ڈالتی ہے، بلکہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کی برکت سے اس شر سے جو تقدیر میں چلتا آرہا تھا سلامتی عطا فرمادی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شر سے سلامتی مقدر فرمادی اور سلامتی کے اسباب بھی مقدر فرمادیئے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے سے وہ شر جو اس کی تقدیر میں مسلسل چلا آرہا تھا ٹال دیا، ایک ایسے سبب کے عوض جو بندے سے ظاہر ہوگا اور وہ دعا ہے، چنانچہ بندے کا دعا کرنا اور اسے سلامتی کا حاصل ہوجانا بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بندے کی عمر کا لمبا ہونا تقدیر میں لکھا ہوا ہے اور اس لمبی عمر کا راز بھی تقدیر میں لکھا ہوا ہے، جو کہ نیکی اور صلہ رحمی سے عبارت ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام اسباب اور ان کے نتائج و مسببات اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر سے ہیں۔

یہی معنی رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا کیا جائے گا:

(من سرہ أن یبسط لہ فی رزقہ أو ینسأ لہ فی أثرہ فلیصل رحمہ)[1]
یعنی جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ اس کے رزق میں کشادگی، اور عمر میں طوالت و برکت عطا فرمادی جائے وہ اپنے رشتے داروں سے جوڑ کر رکھے۔

بہرحال ہر انسان کی اجل (موت کا وقت) لوحِ محفوظ میں ایک امر مقدر ہے، جو نہ آگے ہوسکتا ہے نہ پیچھے۔ جیسا کہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے:

[وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ][2]

ترجمہ: اور جب کسی کا مقررہ وقت آجاتا ہے پھر اسے اللہ تعالیٰ ہرگز مہلت نہیں دیتا۔

نیز فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری ۲۰۶۷، صحیح مسلم ۲۵۵۷
[2] المنافقون: ۱۱

[لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ] [1]

ترجمہ: ہر امت کیلئے ایک معین وقت ہے جب ان کا وہ معین وقت آپہنچتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے سرک سکتے ہیں۔

جو بھی انسان مرتا ہے یا قتل ہوتا ہے، معتزلہ کا یہ قول کہ "جو انسان قتل ہوتا ہے اس کی طبعی عمر کٹ جاتی ہے، اور اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو دوسری اجل یعنی لمبی عمر جیتا" باطل ہے، ہر انسان کیلئے ایک ہی اجل مقدر ہے، البتہ موت کے اسباب مختلف ہیں اور وہ بھی سب کے سب مقدر ہیں، چنانچہ کچھ لوگوں کا مرض کے نتیجہ میں، کچھ کا ڈوب کر، اور کچھ کا قتل ہو کر مرنا مقدر ہوتا ہے (بہرحال سب کی اجل ایک ہی ہے البتہ اسباب اجل مختلف ہیں)

گناہ کے کاموں پر تقدیر سے حجت پکڑنا جائز نہیں

کسی شخص کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے چھوڑنے یا اللہ تعالیٰ کے کسی حرام امر کے ارتکاب کرنے کے سلسلے میں تقدیر کو بطور دلیل وحجت پیش کرے (مثلاً یوں کہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا تقدیر میں یونہی لکھا ہوا ہے، یا میں شراب پیتا ہوں تو تقدیر میں یونہی لکھا ہوا ہے)

اگر کوئی شخص کسی ایسی معصیت کا ارتکاب کرے جس پر شرعی حد نافذ ہوتی ہے، اور وہ اپنی اس معصیت کا بہانہ یا عذر تقدیر کو قرار دے اور کہے کہ تقدیر میں ایسا ہی لکھا ہوا تھا، تو اس شخص پر شرعی حد نافذ کر کے اسے آگاہ کر دیا جائیگا کہ یہ حد اور سزا بھی تقدیر میں لکھی ہوئی تھی۔

حدیث "احتجاج آدم علی موسیٰ" کی توضیح

اب یہاں ایک حدیث کی وضاحت ضروری ہے جس میں آدم وموسیٰ علیہما السلام کا ایک جھگڑا مذکور

[1] یونس: ۴۹

ہے، چنانچہ صحیح بخاری (۳۴۰۹) اور صحیح مسلم (۲۶۵۲) میں ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(احتج آدم وموسى .فقال له موسى: أنت آدم الذى أخرجتك خطيئتك من الجنة. فقال له آدم :أنت موسى الذى اصطفاك الله برسالاته ، وبكلامه.ثم تلومني على أمر قدر علي قبل أن أخلق.فقال رسول الله ﷺ فحج آدم موسى. مرتين)

ترجمہ: آدم اور موسیٰ علیہما السلام کے مابین ایک جھگڑا ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ آدم ہیں جنہیں آپ کے گناہ نے جنت سے نکلوا دیا، آدم علیہ السلام نے فرمایا: تم موسیٰ ہو، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام سے مشرف فرمایا، تم مجھے ایسے مسئلہ میں ملامت کرتے ہو جو میری پیدائش سے بھی قبل میری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو بار فرمایا: آدم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔

حدیث احتجاج آدم علی موسیٰ کا مفہوم

واضح ہو کہ اس حدیث میں آدم علیہ السلام نے فعل معصیت پر تقدیر کو بطور حجت پیش نہیں کیا، بلکہ معصیت کے نتیجے میں نازل ہونے والی مصیبت پر تقدیر کو بطور حجت پیش کیا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے "شفاء العلیل" کا تیسرا باب اس حدیث پر بحث کرنے کیلئے قائم فرمایا، اس باب میں پہلے تو انہوں نے اس حدیث کی تشریح کے حوالے سے لوگوں کے غلط اقوال کا تذکرہ کیا، پھر قرآن حکیم کی وہ آیات نقل فرمائیں جن میں مشرکین کا اپنے شرک کے ارتکاب کرنے پر تقدیر میں لکھے ہوئے کو بطور بہانہ یا حجت پیش کرنے کا ذکر ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس حجت کو پیش کرنے پر انہیں جھوٹا قرار دیا؛ کیونکہ وہ اپنے شرک اور کفر پر قائم ومصر رہتے ہوئے تقدیر میں لکھے ہوئے کا عذر پیش کر رہے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ ان کا مبتلائے شرک ہونا تقدیر میں لکھا ہوا ہے، مگر ان کا اسے اپنے شرک کی صحت پر محمول کرنا ایک امر باطل ہے، لہٰذا ان

کا قول حق ہے، مراد باطل ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے حدیث مذکور (آدم وموسیٰ کا مناظرہ) کا معنی بیان کرتے ہوئے دو توجیہیں نقل فرمائیں، پہلی توجیہ اپنے شیخ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حوالے سے، اور دوسری توجیہ اپنے فہم اور استنباط سے پیش فرمائی۔

چنانچہ (ص ۳۵ تا ۳۶) میں فرماتے ہیں:

"جب آپ نے یہ بات پہچان لی، تو پھر واضح ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کی جو معرفت حاصل ہے اس کے پیش نظر ان کا مقام اس بات سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی کو کسی ایسے گناہ پر ملامت کریں جس سے وہ توبہ کر چکا ہے بلکہ توبہ قبول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت بھی دی اور اپنا چنا ہوا بندہ بھی قرار دے دیا، اور آدم کو جو اپنے پروردگار کی معرفت حاصل تھی اس کے پیش نظر ان کا مقام اس سے کہیں اونچا ہے کہ وہ اپنی معصیت کیلئے تقدیر میں لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کریں، بلکہ اصل معاملہ یوں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام کو معصیت پر نہیں اس مصیبت پر ملامت فرمائی جس کا جنت سے نکلنے اور فتنوں اور آزمائشوں کے گھر میں آنے کی وجہ سے ان کی پوری اولاد کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے آدم علیہ السلام سے فرمایا: (أخرجتنا ونفسك من الجنة) یعنی آپ نے اپنے آپ کو اور ہم سب کو جنت سے نکلوا دیا، اور ایک حدیث میں (خیبتنا) کا لفظ بھی مروی ہے، یعنی آپ نے ہمیں نامراد بنا دیا، اس کے جواب میں آدم علیہ السلام نے ان پر اور ان کی پوری ذریت پر نازل ہونے والی اس مصیبت پر تقدیر میں لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش فرمایا، اور فرمایا: یہ مصیبت جو میری غلطی کے بسبب میری اولاد کو حاصل ہوئی، یہ میر پیدائش سے بھی قبل تقدیر میں لکھی جا چکی تھی، تقدیر میں لکھے ہوئے کو مصیبتوں میں بطورِ حجت پیش کیا جاتا ہے، عیبوں اور گناہوں میں نہیں، لہٰذا آدم علیہ السلام کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ تم مجھے اس مصیبت پر ملامت کیوں کر رہے ہو جو

مجھ پر اور میری اولاد پر میری پیدائش سے بھی ہزاروں سال قبل لکھ دی گئی تھی۔

یہ ہمارے شیخ کا جواب ہے، جبکہ ہمیں اس کا ایک دوسرا جواب بنتا دکھائی دے رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ گناہ پر تقدیر کے لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کرنا ایک مقام پر درست اور نافع ہے، اور ایک مقام پر غلط اور نقصان دہ ہے، نافع اس وقت ہے جب بندے سے گناہ سرزد ہو جائے اور وہ اس پر توبہ کر لے اور پھر کبھی اس گناہ کی طرف جھانک کر بھی نہ دیکھے، جیسا کہ آدم علیہ السلام نے کیا، تو اس صورت میں اپنے گناہ کو نوشتہ تقدیر قرار دینا عین توحید بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی معرفت کی علامت بھی۔

دریں صورت تقدیر کا ذکر، ذکر کرنے والے اور سننے والے دونوں کو فائدہ دے گا؛ کیونکہ تقدیر کے ذکر سے نہ تو وہ کسی امر یا نہی کو ٹال سکتا ہے نہ ہی شریعت کو باطل کر سکتا ہے، اس سے تو توحید کی اساس پر محض حق کا ذکر کرنا مقصود ہوتا ہے، نیز یہ کہ بندہ یہ اقرار کرتا ہے کہ نیکی کرنے یا برائی کے چھوڑنے کی مجھ میں کوئی طاقت نہیں (یہ تو محض اللہ کی توفیق ہی سے ممکن ہے)

(یہ بات تھوڑی سی دقیق ہے) لہٰذا ہم آدم علیہ السلام کے واقعہ سے کچھ توضیح کرتے ہیں:

آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا: تم مجھے میرے ایک ایسے گناہ کہ جو میری پیدائش سے قبل ہی تقدیر میں لکھا جا چکا تھا کے ارتکاب پر ملامت کر رہے ہو؟ چنانچہ جب انسان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، پھر وہ توبہ کر لے اور اس کا گناہ اس طرح ڈھل جائے کہ گویا سرزد ہی نہیں ہوا تھا، اس کے بعد کوئی شخص اسے اس گناہ کے ارتکاب پر ملامت کرے تو دریں صورت اس کا تقدیر کے لکھے ہوئے کو محض حجت بنانا درست ہوگا، اب وہ یہ کہہ سکتا ہے گناہ کا یہ معاملہ میری تقدیر میں میری پیدائش سے قبل ہی لکھا جا چکا تھا۔ اب وہ تقدیر کے ذکر سے نہ تو حق کو ٹال رہا ہے، نہ ہی تقدیر میں لکھے ہوئے کو اپنے گناہ کے جواز کیلئے بطورِ دلیل پیش کر رہا ہے (کیونکہ وہ تو اپنے اس گناہ سے سچی توبہ کر چکا ہے) لہٰذا اب تقدیر کے لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کرنے کا کوئی نقصان نہیں ہے

(بلکہ فائدہ ہے کیونکہ یہ اقرارِ عقیدہ توحید کی پختگی کی علامت ہے اور اپنے عجز وضعف کا اظہار بھی ہے کہ گناہ سے بچنا اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے)

واضح ہو کہ گناہ پر تقدیر کے لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کرنے کا جو نقصان دہ مقام ہے اس کا تعلق زمانہ حال اور مستقبل سے ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ بندہ کسی حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے، یا کسی فریضے کے ترک کا مرتکب ہوتا ہے (اور توبہ بھی نہیں کرتا) اب اسے کوئی ملامت کرتا ہے اور وہ اپنے اس گناہ کے ارتکاب بلکہ اصرار پر تقدیر کے لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کرے (یعنی یوں کہے کہ تقدیر میں یونہی لکھا ہے کہ میں یہ گناہ کرتا ہوں یا کرتا رہونگا) تو یہ یقیناً نقصان دہ صورت ہے؛ کیونکہ اس طرح وہ تقدیر کی حجت کے ذریعے اپنے حق کو ترک کرنے، یا باطل کا ارتکاب کرنے کا جواز پیش کررہا ہے۔

چنانچہ مشرکین نے اپنے عبادت لغیر اللہ اور شرک کے مسلسل اصرار پر نوشتہ تقدیر ہی کو بطورِ حجت پیش کیا تھا، انہوں نے کہا تھا:

[لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا][1]

یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم، نہ ہمارے آباء واجداد شرک کرتے۔ (ہم جو شرک کررہے ہیں تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ یونہی چاہتا ہے اور اس نے اسی طرح لکھا ہوا ہے)

ایک اور مقام پر ان کا یہ قول مذکور ہے:

[لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ][2]

یعنی: اگر رحمن چاہتا تو ہم ان بتوں کی پوجا نہ کرتے۔

لہذا وہ اپنے شرک کے جواز پر تقدیر کو بطورِ حجت پیش کررہے ہیں، نہ تو انہیں اپنے شرک پر

[1] الانعام:۱۴۸
[2] الزخرف:۲۰

کوئی ندامت یا شرمندگی ہے۔ نہ اس شرک کو مستقبل میں چھوڑنے کا کوئی عزم یا ارادہ ہے اور نہ ہی اس شرک کے باطل یا فاسد ہونے کا اقرار واعتراف ہے۔ گناہ پر تقدیر کو حجت ماننے کی یہ صورت، پہلی صورت سے بالکل برعکس ہے، کیونکہ پہلی صورت میں گناہ کا اقرار بھی ہے کہ اس کے ارتکاب پر ندامت بھی ہے اور اسے ہمیشہ چھوڑ دینے کا عزم بھی ہے لہذا دریں صورت اگر کوئی ملامت کرے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق ہوا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ارتکابِ معصیت کے بعد اس کی قباحت وملامت اگر (توبہ کے ذریعہ) ختم ہوجائے تو نوشتہ تقدیر کو بطورِ حجت ذکر کرنا درست ہے اور اگر ارتکابِ معصیت کے بعد اس کی قباحت وملامت قائم ہے (اور بندہ نہ تائب ہے نہ نادم اور نہ اس کے ترک پہ عازم) تو تقدیر کے لکھے ہوئے کو بطورِ حجت پیش کرنا باطل ہے (کیونکہ یہ تو اس گناہ کا جواز پیش کرنے کے مترادف ہوگا)

فرقہ قدریہ پر رد

قولہ: " تعالیٰ ان یکون فی ملکہ مالا یرید، أو یکون لاحد عنه غنی، خالقا لکل شئ، ألا هو رب العباد ورب اعمالهم، والمقدر لحركاتهم وآجالهم"

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس بات سے بہت بلند ہے کہ اسکی بادشاہت میں کوئی چیز اس کے ارادے کے بغیر یا برخلاف ہو، یا کوئی مخلوق اس سے مستغنی ہو، ہر شئ کا صرف وہی خالق ہے، تمام بندوں اور انکے تمام اعمال کا وہی رب ہے، اور انکی تمام حرکات وآجال کی تقدیر بنانے والا بھی وہی ہے۔

افعالِ عباد، اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور یہ بندوں کی مشیئت سے واقع ہوتے ہیں۔۔۔

واضح ہو کہ یہ تمام جملے، فرقہ ضالہ قدریہ پر رد ہیں، جن کا عقیدہ یہ ہے کہ بندے اپنے افعال کے خود ہی خالق ہیں، اسی طرح بندوں کے افعال کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو تسلیم نہیں

کرتے۔ان کا کہنا ہے کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے اندر ہی سرزد ہورہے ہیں مگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر نہیں ہیں۔اب بندے چونکہ اپنے افعال کے خود ہی خالق ہیں لہذا وہ اللہ تعالیٰ سے مستغنی ہیں۔قدریہ کے ان معتقدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ہر شئی کا خالق تسلیم نہیں کرتے۔(والعیاذ باللہ)

حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا بھی خالق ہے اور ان کے تمام افعال کا بھی،وہ تمام ذوات کا خالق ہے،اور تمام صفات کا بھی۔چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ⑯][1]

ترجمہ: کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی تمام چیزوں کا خالق ہے وہ اکیلا ہے اور زبردست غالب ہے۔

نیز فرمایا:[اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ⑫][2]

ترجمہ: اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔

نیز فرمایا:[وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ⑯][3]

ترجمہ: حالانکہ تمہیں اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔

فرقۂ جبریہ پر رد

قدریہ (منکرین تقدیر) کے مقابلے میں ایک اور گمراہ فرقہ ہے جو جبریہ کے نام سے موسوم ہے،انہوں نے بندوں سے ہر قسم کا اختیار سلب کر دیا ہے،اور انہیں ہر قسم کی مشیئت وارادہ سے عاری قرار دیا ہے،یہ لوگ اختیاری اور اضطراری تمام حرکات میں برابری کے قائل ہیں،ان کا کہنا ہے کہ بندوں کا ہر فعل یا حرکت،درختوں کی حرکت کی طرح ہے۔

---
[1] الرعد:۱۶
[2] الزمر:۶۲
[3] الصافات:۹۶

ان کا کہنا ہے کہ بندوں کا کھانا،پینا یا نماز،روزہ ایسے اعمال ان کے ارادے سے صادر نہیں ہوتے،بلکہ وہ ان اعمال کے اصدار پر مجبور ہیں۔جیسے ایک رعشہ کا مریض،اپنے ارادہ یا اختیار سے اپنے ہاتھ نہیں ہلاتا،بلکہ بہ سبب مرض مجبوراً اس کے ہاتھ ہلتے رہتے ہیں،لہذا (بقول ان کے) بندوں کے افعال وحرکات میں،ان کے کسب وارادہ کو کوئی دخل نہیں۔

ان سے پوچھا جائے کہ پھر انبیاء ومرسلین کی بعثت کا کیا فائدہ رہا؟کتب سماوی کے نزول کی کیا حکمت رہی؟

شرعی ادلہ سے انتہائی قطعیت کے ساتھ یہ بات معلوم اور ثابت ہے کہ عمل کے تعلق سے بندے کو ایک طرح کا ارادہ ومشیئت حاصل ہے چنانچہ وہ اپنے ہر نیک عمل پر قابل تعریف بھی ہے اور مستحق اجر وثواب بھی جبکہ ہر بُرے فعل پر قابل مذمت بھی ہے،اور مستحق عذاب بھی۔

اس کے تمام اختیاری افعال،باعتبار فعل وکسب اسی کی طرف منسوب ہوں گے،جبکہ اس کی تمام اضطراری حرکات،مریض رعشہ کی حرکت کی مانند قرار پائیں گے وہ اضطراری حرکت بندے کا فعل نہیں قرار پائی گی،بلکہ اس کی صفت (کیفیت یا حالت) شمار ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ علماءِ نحو فاعل کی تعریف یوں کرتے ہیں "هو اسم مرفوع يدل على من حصل منه الحدث أو قام به" یعنی: فاعل ایک ایسا اسم ہے جو مرفوع ہوتا ہے،اور ایک ایسی ذات پر دلالت کرتا ہے جس سے یا تو کوئی کام صادر ہوتا ہے،یا کوئی کام اسکے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

کام کے صادر ہونے سے ان کی مراد بندے کے وہ اختیاری افعال ہیں جو اس کی مشیئت وارادہ سے صادر ہوتے ہیں (جیسے نماز،روزہ،کھانا،پینا وغیرہ) اور کام کے اس کے ساتھ قائم ہونے سے ان کی مراد ایسے کام جس میں اس کی مشیئت وارادہ کو کوئی دخل نہیں،جیسے موت،مرض اور ارتعاش وغیرہ۔

چنانچہ جب یوں کہا جائے گا کہ: زید نے کھایا،پیا،نماز پڑھی یا روزہ رکھا،تو ان تمام مثالوں میں

زید ایک ایسا فاعل ہے جس کے اختیار سے کھانا، پینا، نماز پڑھنا یا روزہ رکھنا ایسے اعمال صادر ہو رہے ہیں۔ اور جب یوں کہا جائے کہ: زید بیمار ہوا، یا زید فوت ہوا، یا زید کے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہوا، تو ان تمام مثالوں میں جو افعال (بیمار ہونا، مرنا وغیرہ) مذکور ہیں وہ زید کا فعل قرار نہیں پائیں گے۔ بلکہ ایسے اوصاف یا احوال قرار پائیں گے جو زید کے ساتھ (بامر اللہ) لاحق وقائم ہوئے (جن میں زید کے ارادہ و مشیئت کو کوئی دخل نہیں ہے۔)

اہل سنت کا مسلک اعتدال پر قائم ہے

واضح ہو کہ افعالِ عباد کے تعلق سے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ، جبریہ اور قدریہ کے گمراہ عقیدوں کے بین بین انتہائی اعتدال پر قائم ہے۔ چنانچہ قدریہ تو تقدیر کے سراسر منکر ہیں، جبکہ جبریہ نے تقدیر کے اثبات میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ بندے سے ہر قسم کے ارادہ و مشیئت کو سلب کر کے رکھ دیا۔ جبکہ اہل السنۃ والجماعۃ اعمال کے تعلق سے بندوں کیلئے مشیئت ثابت کرتے ہیں جبکہ اللہ رب العزت کیلئے مشیئت عامہ کے اثبات کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ بندوں کی مشیئت کو اس طرح تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی مشیئت اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تابع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؀] [1]

ترجمہ: اور تم بغیر پروردگارِ عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔

لہذا اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں اللہ تعالیٰ کی مشیئت و مرضی کے خلاف کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی۔ یعنی جو چیز اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا وہ واقع ہو ہی نہیں سکتی، بخلاف قدریہ کے جو کہتے ہیں: بندے اپنے تمام افعال کے خود ہی خالق ہیں اور بخلاف جبریہ کے جو کہتے ہیں کہ بندے اس قدر مسلوبِ ارادہ و مشیئت ہیں کہ کسی بھی گناہ کے ارتکاب پر انہیں مستحق سزا قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ

[1] التکویر: ۲۹

اس گناہ کے ارتکاب میں ان کے ارادہ و مشیئت کو کوئی دخل نہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ہماری اس تقریر سے ایک سوال کا جواب آسان ہو گیا جو بار بار پوچھا جاتا ہے اور وہ یہ کہ: بندہ مسیر ہے یا مخیر؟

مخیر سے مراد: جسے اپنے افعال و اعمال پر اختیار حاصل ہو، اور مسیر سے مراد جو ہر قسم کے اختیار، ارادہ اور مشیئت سے عاری ہو، اور جس طرح چلایا جائے اسی طرح چلنے پر مجبور ہو۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نہ تو اسے مطلقاً مسیر کہا جا سکتا ہے نہ مطلقاً مخیر، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ وہ اس اعتبار سے مخیر ہے کہ اسے اپنے افعال کی انجام دہی میں مشیئت و ارادہ حاصل ہے، جس کی بناء پر اس کے تمام اعمال اس کا کسب قرار پاتے ہیں، چنانچہ وہ ہر نیک عمل پر مستحق ثواب، اور ہر برے عمل پر مستحق عذاب ہے۔ جبکہ بندہ اس اعتبار سے مسیر ہے کہ اس سے صادر ہونے والا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے خارج نہیں بلکہ ہر عمل اللہ تعالیٰ کی مشیئت، ارادہ، خلق اور ایجاد کے دائرہ میں ہے۔

ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی مشیئت و ارادہ سے حاصل ہوتی ہے

قولہ: یضل من یشاء، فیخذلہ بعدلہ، ویھدی من یشاء فیوفقہ بفضلہ. فکل میسر بتیسیرہ الی ماسبق من علمہ وقدرہ، من شقی او سعید

ترجمہ: جسے چاہتا ہے، بتقاضہ عدل گمراہ کر کے ذلتوں اور پستیوں میں پھینک دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بتقاضہ فضل ہدایت و توفیق سے سرشار فرما دیتا ہے، لہذا ہر بدبخت یا نیک بخت پر، اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور اس کی لکھی ہوئی تقدیر کے مطابق اس کی توفیق سے (برا یا اچھا) راستہ آسان کر دیا گیا۔

ہر ہدایت یافتہ انسان کیلئے ہدایت، اور گمراہ شخص کی گمراہی، اللہ تعالیٰ کی مشیئت وارادہ سے حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کیلئے سعادت اور ضلالت کا راستہ بیان فرمادیا ہے، اور انہیں زیورِ عقل سے بھی آراستہ فرمادیا جس کی مدد سے وہ نفع بخش اور نقصان دہ چیز میں تمیز کرسکیں، چنانچہ جو ہدایت کا انتخاب کرکے اس پر رواں دواں ہوگیا وہ ضرور بالضرور سعادت کاملہ کے عظیم صلہ کو حاصل کرے گا۔ سعادت کی اس راہ پر چلنے میں بندے کی مشیئت وارادہ کو پورا پورا دخل حاصل ہے، اور بندے کی یہ مشیئت وارادہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی مشیئت وارادہ کے تابع ہے، اور ہدایت کا یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کے بہ سبب ہے۔ اور جس شخص نے طریق ضلالت کا انتخاب کرکے اسے اپنالیا وہ یقیناً شقاوت (بدبختی) کے گڑھے میں جاگرے گا، بندے کے گمراہی کے راستہ کو منتخب کرنے میں اس کی مشیئت وارادہ کو مکمل دخل حاصل ہے، اور بندے کی یہ مشیئت وارادہ، اللہ تعالیٰ کی مشیئت وارادہ کے تابع ہے، اور شقاوت کا یہ معاملہ عدل کے بہ سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝٨ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝٩ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝١٠] [1]

ترجمہ: کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں۔ اور زبان اور ہونٹ (نہیں بنائے)۔ ہم نے دکھادیئے اس کو دونوں راستے۔

نیز فرمایا:

[اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝٣] [2]

ترجمہ: ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔

---

[1] البلد: ۱۰-۸

[2] الدھر: ۳

نیز فرمایا:

[مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۝١٧] [1]

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جس کی رہبری فرمائے وہ راہِ راست پر ہے اور جسے وہ گمراہ کردے ناممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی کارساز یا رہنما پاسکیں۔

ہدایت ِ ارشاد اور ہدایت ِ توفیق میں فرق

ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ایک ہدایت ِ ارشاد، دوسری ہدایت توفیق

ہدایت ارشاد: (جس سے مراد راہِ ہدایت کی دعوت دینا ہے) سب کو حاصل ہے؛ کیونکہ دین کی دعوت عمومیت کے ساتھ سب ہی کیلئے ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان:

[وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٥٢] [2]

ترجمہ: آپ ﷺ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتے ہیں۔

میں اسی قسم یعنی ہدایت ارشاد کا ذکر ہے۔

ہدایت توفیق: (جس سے مراد راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق کا میسر آجانا ہے) اس شخص کو حاصل ہوسکتی ہے، جس کی ہدایت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ کے درج ذیل فرمان میں اسی قسم کا ذکر ہے:

[اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ] [3]

ترجمہ: آپ ﷺ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔

---

[1] الکھف: ۱۷

[2] الشوری: ۵۲

[3] القصص: ۵۶

اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ان دونوں قسموں کو اس آیت کریمہ میں جمع فرمادیا ہے:

[وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵][1]

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف تم کو بلاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہِ راست کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان: [وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ] میں دعوت ارشاد کا ذکر ہے؛ کیونکہ دعوت کے مخاطب تمام لوگ ہیں۔ ارادۂ عموم کی وجہ سے مفعول محذوف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ راہ نمائی تو سب کی کردی گئی ہے، مگر قبول کون کرتا ہے ؟۔۔۔ وہی، جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ہدایت میسر ہو۔ اس بات کا ذکر اس آیت کریمہ کے دوسرے حصے میں فرمادیا: [وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵] یہاں مفعول ظاہر کردیا تاکہ خصوص کا فائدہ حاصل ہوجائے، مقصد یہ ہے کہ ہدایت کی توفیق ان مخصوص افراد کو ملتی ہے جن کی ہدایت اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

معتزلہ کے رد میں دو حکایتیں

ہمارے شیخ محمد الامین الشنقیطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "رفع ایہام الاضطراب عن آیات الکتاب" کے اندر سورۃ الشمس کی تفسیر میں دو حکایتیں ذکر فرمائی ہیں، جن سے تقدیر کے مسئلہ میں معتزلہ کے مذہب کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

پہلی حکایت: فرماتے ہیں: جب امام ابو اسحاق الاسفرائنی نے معتزلی عالم عبد الجبار کے ساتھ مناظرہ کیا، تو اس موقع پر مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

عبد الجبار معتزلی نے کہا: پاک ہے وہ ذات جو گناہوں سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کا مقصد

[1] یونس: ۲۵

یہ تھا کہ مثلاً: چوری اور زنا وغیرہ بندے کی مشیئت سے سرزد ہوتے ہیں، ان کے سرزد ہونے میں اللہ تعالیٰ کی مشیئت کو کوئی دخل حاصل نہیں، کیونکہ ان کے زعم میں اللہ تعالیٰ کی ذات اس بات سے کہیں بلند و بالا ہے کہ وہ گناہوں اور معصیتوں کی مشیئت فرمائے۔

ابو اسحاق نے فرمایا: یہ کلمہ حق ہے مگر مراد باطل ہے۔ پھر فرمایا: پاک ہے وہ ذات جس کی بادشاہت میں صرف وہی کچھ ہورہا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

عبد الجبار نے کہا: اگر وہ گناہوں اور معصیتوں کا خالق ہے تو پھر ان کے ارتکاب پر مجھے عذاب کیوں دے گا؟

ابو اسحاق نے فرمایا: اگر گناہ کا صدور (اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے برخلاف) تمہاری مشیئت سے ہے، تو پھر تمہاری مشیئت اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر غالب آگئی، اور اللہ تعالیٰ کی مشیئت تمہاری مشیئت کے سامنے بے بس ہوگئی، تو کیا تم رب ہو اور وہ بندہ؟۔

عبد الجبار نے کہا: بتاؤ، اللہ تعالیٰ مجھے دعوت تو ہدایت کی دے لیکن اپنی مشیئت سے میرے لئے فیصلہ گمراہی کا فرمادے، تو یہ اس کی میرے ساتھ بھلائی ہے یا برائی؟

ابو اسحاق نے فرمایا: جس ہدایت کو اس نے تجھ سے منع فرمادیا، اگر تو اس کا مالک ہے تو پھر یقیناً اس نے برا کیا، اور اگر اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اس کا عطا فرمادینا فضل ہے اور منع فرمادینا عدل ہے۔ اس پر عبد الجبار مبہوت اور لاجواب ہوگیا۔

تمام حاضرین عش عش کراٹھے، اور کہنے لگے، واللہ! اس بات کا کوئی دوسرا جواب ممکن ہی نہیں۔

دوسری حکایت: ایک اعرابی، عمرو بن عبید کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہا: میری گدھی چوری ہوگئی ہے، دعا کریں اللہ تعالیٰ مجھے لوٹادے۔

عمرو بن عبید نے یوں دعا کی: اے اللہ! اس شخص کی گدھی چرالی گی ہے، اور اس کے چرانے

جانے میں تیر مرضی اور چاہت شامل نہیں، لہذا یہ گدھی اس شخص کو واپس لوٹا دے۔

اعرابی نے کہا: اپنی یہ خبیث دعا بند کردے، اگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہی تھا کہ گدھی چوری نہ ہو، مگر پھر بھی چوری ہوگئی، تو پھر ہو سکتا ہے کہ اس کا ارادہ تو لوٹانے کا ہو، مگر وہ لوٹائی نہ جاسکے۔

❂❂❂❂❂❂❂❂❂

جبریل کا تیسرا سوال: احسان کیا ہے؟

جبریل امین کا تیسرا سوال: (فأخبرني عن الإحسان) یعنی: مجھے احسان کے متعلق خبر دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (الإحسان أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك)

یعنی: احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

احسان، باب (أحسن يحسن) سے مصدر ہے، جس کا لغوی معنی نیکی کرنا یا بھلائی عام کرنا۔

احسان بحق مخلوق یہ ہے کہ ان کیلئے خیر عام کی جائے، خواہ اس کا تعلق مالی خیرخواہی سے ہو یا عزت ووقار کے تعلق سے ہو یا کسی اور نوعیت کی نیکی ہو۔

احسان کی دو قسمیں، احسان بحق مخلوق اور احسان بحق خالق

احسان بحق خالق یہ ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس عبادت میں دو چیزوں کا پورا پورا اہتمام کیا جائے: ایک اخلاص اور دوسری رسول اللہ ﷺ کی متابعت، بندہ اس اخلاص اور متابعت میں جس قدر کامل ہوتا جائے گا اس قدر کمال کے ساتھ مرتبہ احسان پر فائز ہوتا جائے گا۔

احسان کی تفسیر بفرمان نبوی ﷺ

حدیث جبریل میں احسان کی تفسیر میں دو چیزوں کا ذکر ہے:

① (أن تعبد الله كأنك تراه)

اس جملے سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کے سامنے کھڑے اسے دیکھ رہے ہو، جس بندہ کی یہ کیفیت ہوجائے یقیناً وہ اپنی عبادت میں کمال وتمام کا پہلو ملحوظ رکھے گا، اور اسے ہر قسم کے نقص سے بچائے گا۔

عبادت کے تعلق سے یہ سب سے عظیم مرتبہ ہے، یہ شوق ومحبت اور طلب کی عبادت شمار ہوتی ہے، اس عبادت میں اللہ تعالیٰ کی طرف قصد وانابت اور حصول قرب کا حسن ہوتا ہے، یہ احسان کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔

② (فإن لم تكن تراه فإنه يراك)

اس جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر مذکورہ حالت وکیفیت نہ ہوسکے تو پھر یہ شعور ضرور ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، اس کا کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ تصور بھی اگر دل میں جاگزیں ہوجائے تو یقیناً احسان ہی قرار پائے گا؛ کیونکہ جس شخص کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہر وقت اور ہر حال میں دیکھ رہا ہے تو وہ اس کی ہر نہی سے بچنے اور ہر امر کو انجام دینے پر ہمیشہ مستعد رہے گا۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ نے احسان کی پہلی صورت (أن تعبد الله كأنك تراه) کو مرتبۂ طلب وشوق قرار دیا ہے، جبکہ دوسری صورت (فإن لم تكن تراه فإنه يراك) کو مرتبۂ ہرب وخوف قرار دیا ہے، یعنی یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، بندہ کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف اجاگر کرے گا، اس خوف کے پیدا ہونے کا ثمرہ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتا رہے گا، اور اس کی عبادت کرتا رہے گا تاکہ اس کے عذاب سے بچ سکے۔

پہلا درجہ اتم واکمل ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے پہلے ذکر فرمایا، جبکہ دوسرا درجہ پہلے کے مقابلے میں ادنیٰ شمار ہوتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے بعد میں ذکر فرمایا، لیکن

دونوں درجے چونکہ احسان کے ہیں، لہٰذا انتہائی مستحسن ہیں۔

"احسان" کا اعلیٰ مقام

اسلام، ایمان اور احسان میں سب سے اعلیٰ مقام احسان کا ہے، دوسرا ایمان کا اور آخری درجہ اسلام کا ہے، ہر محسن، مؤمن اور مسلم ہے اور ہر مؤمن، مسلم ہے، لیکن ہر مؤمن محسن نہیں ہوسکتا، نہ ہی ہر مسلم، مؤمن اور محسن ہوسکتا ہے۔

احسان کی تعریف پر ابن رجب رحمہ اللہ کا کلام

علامہ ابن رجب بغدادی رحمہ اللہ اپنی کتاب (جامع العلوم والحکم) میں حدیث جبریل کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا احسان کی تعریف میں یہ فرمانا: (أن تعبدالله كأنك تراه) اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ ذکر کردہ کیفیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکتا ہے، چنانچہ وہ دوران عبادت اللہ تعالیٰ کے قرب کا اس طرح استحضار کرلے کہ گویا وہ اس کے سامنے ہے اور اسے دیکھ رہا ہے، اس کیفیت کا استحضار یقیناً بندہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی خشیت، خوف، محبت اور تعظیم کے پیدا ہونے کا موجب بن جائے گا، ایک دوسری حدیث جو بروایت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے، میں (تعبد) کی جگہ (تخشى) کا لفظ وارد ہے، یعنی: (أن تخشى الله كأنك تراه) اور یہی خشیت اس امر کی متقاضی ہوگی کہ بندہ عبادت کے اندر خیر خواہی پیدا کرنے اور اسے علی وجہ الکمال ادا کرنے کی بھرپور سعی کرتا ہے اور یہی عبادت کا حسن ہے۔ (جسے حدیث میں احسان کہا گیا ہے)[1]

حدیث میں وارد دوسرے جملے (فإن لم تكن تراه فإنه يراك) کی شرح کرتے ہوئے، علامہ ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

[1] جامع العلوم والحکم ۱/ ۱۲۹-۱۲۸

یہ جملہ پہلے جملے کی علت ہی قرار پائے گا، پہلے جملے میں بندہ اپنی عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ایسے قرب کے استحضار پر مأمور ہے جس میں گویا وہ اس کے سامنے ہے اور اسے دیکھ رہا ہے، مگر چونکہ اس کیفیت کا استحضار انتہائی شاق اور دشوار ہے، لہٰذا ایک دوسری کیفیت ذکر کردی گئی، (یعنی اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے) جو کہ نسبتاً بہت آسان ہے، تاکہ بندہ اس کیفیت کے استحضار سے آغاز کرڈالے، تا آنکہ دوسری کیفیت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے۔

جب بندہ دوران عبادت اپنے اندر یہ تصور جمانے میں کامیاب ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر ظاہر و باطن اور خفیہ و اعلانیہ پر مطلع ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، تو اس کے بعد دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونا آسان ہوجائے گا، اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایسا قرب پانے میں کامیاب ہوجائے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احسان عبادت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ گویا اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، اگر اس درجہ کا حصول دشوار ہو تو پھر یہ بھی عبادت کا احسان ہے کہ اس کے اندر یہ تصور جاگزیں رہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، لہٰذا وہ اس کی حیاء کے تقاضے ہمیشہ ملحوظ رکھے۔

❁❁❁❁❁❁❁❁❁

جبریل کا آخری سوال: قیامت وعلامات قیامت کے متعلق

جبریل امین علیہ السلام کا اس حدیث میں آخری سوال قیامت اور علامات قیامت کے بارہ میں ہے۔

جبریل علیہ السلام نے فرمایا: (فأخبرني عن الساعة) یعنی: مجھے قیامت کے (وقوع) کے متعلق خبر دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ما المسئول عنها بأعلم من السائل) یعنی: اس بارہ میں مسئول (جس سے سوال کیا جارہا ہے) سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

تب جبریل امین علیہ السلام نے سوال کیا:(فأخبرني عن أماراتها) یعنی: تو مجھے قیامت کی علامات ہی کی خبر دے دیجئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:(أن تلد الأمة ربتها وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان)

یعنی: (قیامت کی علامات یہ ہیں کہ) لونڈی اپنے آقا کو جنے اور تو دیکھے ننگے پاؤں، ننگے جسموں والے فقیروں کو، نیز بکریوں کے چرواہوں کو، بڑی بڑی عمارتوں میں فخر کرنے والے۔

قیامت، ایک خوفناک اور ہیبتناک منظر

(الساعۃ) گھڑی کے معنی میں مستعمل ہے، یہاں مراد وہ گھڑی ہے جب لوگ اپنی قبروں سے نکل کر، اپنے پروردگار کیلئے ارضِ محشر میں جمع ہونگے، اس خوفناک اور ہیبتناک منظر کو (الساعۃ) یعنی گھڑی اس لئے کہا گیا کہ یہ انتہائی خطرناک اور مصیبت سے بھرپور وقت ہوگا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②][1]

یعنی: لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو! بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت ہی بڑی چیز ہے جس دن تم اسے دیکھ لوگے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور تمام حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور تو دیکھے گا کہ لوگ مدہوش دکھائی دیں گے، حالانکہ درحقیقت وہ متوالے نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔

اس کے علاوہ نفخ صور سے زندہ لوگوں پر جو موت واقع ہوگی وہ بھی (الساعۃ) یعنی: قیامت

[1] الحج: ۲،۱

کہلاتی ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(لاتقوم الساعة إلا على شرار الناس)[1]

یعنی: قیامت نہیں قائم ہوگی مگر انتہائی برے لوگوں پر۔

یہاں قیامت کے وقوع سے مراد، وہ زندہ لوگ ہیں جو صور پھونکنے سے موت کا شکار ہوجائیں گے، ان کی موت کو قیامت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نفخ صور سے قبل مرنے والے لوگوں کا مرنا بھی ان کیلئے وقوعِ قیامت ہے، چنانچہ جو شخص مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہوجاتی ہے، کیونکہ موت کی صورت میں وہ دارالعمل یعنی دنیا سے دارالجزاء یعنی آخرت کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔

قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے

واضح ہو کہ قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ رب العزت کے پاس ہے، کوئی مخلوق وقوعِ قیامت کے وقت سے آگاہ نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ١٨٧][2]

یعنی: یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم صرف میرے رب ہی کے پاس ہے، اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا، وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری (حادثہ) ہوگا وہ تم پر محض اچانک آپڑے

[1] صحیح مسلم: ۲۹۴۹

[2] الاعراف: ۱۸۷

گی۔ وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

نیز فرمایا:

[اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۭ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ؀] [1]

یعنی: بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل فرماتا ہے اور ماں کے پیٹ میں جو ہے اسے جانتا ہے۔ کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا؟ نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ہی پورے علم والا اور صحیح خبروں والا ہے۔

قیامت کا وقوع غیب کی چابی ہے

بلکہ قیامت کا وقوع تو غیب کی چابی ہے، چنانچہ صحیح بخاری (۴۷۷۸) میں جناب عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (مفاتيح الغيب خمسة) یعنی: غیب کی چابیاں پانچ ہیں۔

ان میں سے ایک چابی قیامت کا علم ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر یہ آیت تلاوت فرمائی:

[اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ] [2]

اس سے ثابت ہوا کہ قیامت کے وقوع کا علم، اللہ تعالیٰ کے علم غیب کی چابیوں میں سے ایک چابی ہے، اسی لئے افضل الملائکہ جبریل علیہ السلام نے جب افضل الرسل محمد ﷺ سے قیامت کے وقوع

[1] لقمان: ۳۴

[2] لقمان: ۳۴

کے علم کا سوال کیا تو انہوں نے صاف صاف فرما دیا: (ما المسئول عنها بأعلم من السائل)

قیامت کے وقوع کے علم کو غیب کی چابی قرار دینے کا معنی یہ ہے کہ جب قیامت کے وقوع کا علم کسی کے پاس نہیں ہے، حالانکہ وہ محض ایک چابی کے طور پر ہے، تو ما بعد القیامۃ کا علم کسی کو کیسے ہو سکتا ہے، کون جان سکتا ہے کہ بندوں کا قیامت کے دن حساب کیسا ہوگا؟ کون کامیاب ہوگا اور کون ناکام ہوگا؟ کون جہنم میں ہمیشہ رہے گا اور کون ایک وقت مقرر کیلئے داخل کیا جائے گا؟

اگرچہ بہت سے شعبدہ باز، خاص طور پہ درگاہوں پر بیٹھے پیر اور ان کے مجاور، قیامت کی کامیابیوں یا ناکامیوں کے تعلق سے مختلف دعوے کرتے ہیں، مگر وہ سب جھوٹے ہیں؛ کیونکہ قیامت ایک ایسی چیز ہے جس کی مفتاح یعنی چابی کا علم کسی کے پاس نہیں، تو بعد کی خبروں کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟

قیامت کے وقوع کا سن یا تاریخ بتانے والے جھوٹے ہیں

یہاں یہ بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ آئے دن کوئی نہ کوئی شخص کھڑا ہو کر اپنے خود ساختہ حساب وکتاب کی روشنی میں، قیامت کے وقوع کا سن یا تاریخ بتانے کی کوشش کرتا ہے، یا یہ بتانے کی جرأت کرتا ہے کہ دنیا کی کتنی عمر باقی رہ گئی ہے، اس قسم کے لوگوں کیلئے ہمارا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ دل سے بھی اور زبان سے بھی انہیں جھوٹا کہا جائے۔

اگر کوئی شخص انہیں سچا جانے گا تو وہ کفر کا مرتکب ہوگا، جب افضل الرسل اور افضل الملائکہ تک کو وقوعِ قیامت کا علم نہیں تو کسی دوسرے کو بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔

اصل مہم آخرت کی تیاری ہے

ہمیں ہرگز یہ مہم نہیں سونپی گئی کہ ہم مختلف مفروضوں کو جمع کر کے قیامت کے وقوع کی تاریخ معلوم کرتے پھریں اور پھر اس کی تشہیر وتصویب پر اصرار کرتے رہیں، ہماری مہم تو اللہ تعالیٰ اور

اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے ذریعے ،قیامت کی تیاری کرنا ہے،اور اپنی آخرت کو سنوارنا ہے:

عن أنس بن مالك رضى الله تعالى عنه ،أن رجلا سأل النبى ﷺ عن الساعة.فقال:متى الساعة؛قال :وماذا أعددت لها ؛قال: لاشئ،إلا أنى أحب الله ورسوله ﷺ.فقال:(أنت مع من أحببت)[1]

یعنی: انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،ایک شخص نے نبی ﷺ سے قیامت کے بارہ میں سوال کیا،اس نے کہا: قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے قیامت کیلئے تیاری کیا کی ہے؟ اس نے کہا: کچھ خاص نہیں ،البتہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے بہت محبت کرتا ہوں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اسی کے ساتھ ہوگے جس کے ساتھ (دنیا میں) محبت کرتے ہو۔

قیامت،جمعہ کے دن قائم ہوگی

قیامت کے علم کے بارہ میں احادیث سے صرف اتنی بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ جمعہ کے دن قائم ہوگی:

عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ أن النبی ﷺ قال:(خیر یوم طلعت علیہ الشمس یوم الجمعة ،فیه خلق آدم ،وفیه أدخل الجنة ،وفیه أخرج منها، ولا تقوم الساعة إلافی یوم الجمعة)[2]

یعنی: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،نبی ﷺ نے فرمایا: سب سے بہترین دن جس پر سورج طلوع ہوتا ہے،جمعہ کا دن ہے،اسی دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا،اور اسی دن انہیں جنت میں داخل

[1]صحیح بخاری: ۳۶۸۸،صحیح مسلم: ۲۶۳۹
[2]صحیح مسلم: ۸۵۴

کیا گیا،اور اسی دن جنت سے نکالا گیا،اور قیامت بھی جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت جمعہ کے دن قائم ہوگی،لیکن وہ جمعہ کس سال کا ہوگا؟ کون سا مہینہ ہوگا؟ مہینے کا کون سا جمعہ ہوگا؟ یہ سب نامعلوم ہے۔صرف اللہ رب العزت ہی کو ان تمام باتوں کا علم ہے۔

البتہ ایک حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قیامت جمعہ کے روز،دن کے آغاز میں،سورج کے طلوع ہوتے ہی قائم ہوجائے گی،چنانچہ سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں ان الفاظ سے حدیث وارد ہے:

(خير يوم طلعت فيه الشمس يوم الجمعة، فيه خلق آدم، وفيه أهبط، وفيه تيب عليه، وفيه مات، وفيه تقوم الساعة، وما من دابة إلا وهي مسيخة يوم الجمعة من حين تصبح حتى تطلع الشمس، شفقا من الساعة إلا الجن والإنس)[1]

یعنی: سب سے بہترین دن جس پر سورج طلوع ہوتا ہے،جمعہ کا دن ہے،اس دن آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا،اسی دن زمین پر اتارا گیا،اسی دن ان کی توبہ قبول کی گئی،اسی دن ان کا انتقال ہوا،اور اسی دن قیامت قائم ہوگی،جمعہ کے دن انسانوں اور جنوں کے علاوہ تمام مخلوقات پر فجر کے طلوع ہونے سے لیکر،سورج کے طلوع ہونے تک بڑا خوف طاری رہتا ہے،مبادا قیامت قائم نہ ہوجائے۔

مخلوقات کا خوف سورج طلوع ہونے تک قائم رہتا ہے،جس کا معنی یہ ہوا کہ قیامت کا وقوع دن کے آغاز ہی میں ہوجائے گا،اس کے علاوہ بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سورج کے مغرب سے طلوع ہوتے ہی قیامت قائم ہوجائے گی،یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ قیامت،اول النہار قائم ہوگی۔

[1]ابوداؤد: ۱۰۴۶،نسائی: ۱۴۳۰

علاماتِ قیامت کی حکمت

جبریل امین علیہ السلام نے قیامت کے وقوع کے علم کا سوال اس لئے کیا تا کہ اس علم کو حاصل کر کے لوگ اس کی تیاری کریں، لیکن جب یہ بات واضح ہوگئی کہ قیامت کا علم کسی کے پاس نہیں، تو پھر جبریل علیہ السلام نے اس حوالے سے دوسرا سوال کر دیا، یعنی: قیامت کی علامات؟

علامات سے مراد وہ نشانیاں جو قیامت کے وقوع کے قرب کی نشاندہی کریں، ان نشانیوں کا ظہور بھی بندہ کی تنبیہ کیلئے کافی ہے، اب بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ اور اپنی آخرت کی تیاری کرو، ابھی موقع موجود ہے، ورنہ جب قیامت قائم ہو جائے گی تو نصیحت یا عمل کا کوئی موقع قطعاً کارگر نہ ہوگا۔

[فَهَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّا ٱلسَّاعَةَ أَن تَأۡتِيَهُم بَغۡتَةٗۖ فَقَدۡ جَآءَ أَشۡرَاطُهَاۚ فَأَنَّىٰ لَهُمۡ إِذَا جَآءَتۡهُمۡ ذِكۡرَىٰهُمۡ ۝١٨][1]

یعنی: تو کیا یہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے یقیناً اس کی علامتیں تو آچکی ہیں، پھر جبکہ ان کے پاس قیامت آجائے انہیں نصیحت کرنا کہاں ہوگا؟

واضح ہو کہ کسی حدیث میں قیامت کی جملہ علامات کا ذکر نہیں ملتا، مختلف احادیث میں، مختلف علامات کا ذکر موجود ہے، جنہیں علماء نے اپنی مؤلفات میں جمع کر دیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی کتاب (الفتن والملاحم) میں اس تعلق سے بڑا مواد موجود ہے، اس کے علاوہ تمام کتب حدیث میں (الفتن) یا (أشراط الساعة) کے نام سے ابواب قائم ہیں، جن میں قیامت اور علاماتِ قیامت کا ذکر موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے کسی ایک حدیث میں ان علامات کو جمع نہیں فرمایا، آپ ﷺ کے پاس سائل آتے اور قیامت اور اس کے وقوع کے تعلق سے سوال کرتے تو آپ ﷺ انہیں مناسب

[1] محمد:۱۸

حال جواب عنایت فرماتے، مثلاً: ایک اعرابی آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے قیامت کے وقوع کے بارہ میں پوچھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(فإذا ضيعت الأمانة فانتظر الساعة)[1]

یعنی: جب امانت کو ضائع کر دیا جائے گا تو قیامت کا انتظار کرنا۔

علاماتِ قیامت کی دو قسمیں اور ان کا بیان

علماء کرام نے علاماتِ قیامت کو دو اقسام میں تقسیم کیا ہے:

① علاماتِ قریبہ اور ② علاماتِ بعیدہ

علاماتِ قریبہ سے مراد وہ علامات ہیں جو قیامت کے بالکل نزدیک رونما ہونگی، بلکہ بعض تو قیامت کے ساتھ متصل ظاہر ہونگی، ان علامات میں خروجِ دجال، نزولِ عیسیٰ علیہ السلام خروجِ یاجوج وماجوج، خروجِ دابۃ الارض، خروج النار اور طلوع الشمس من المغرب وغیرہ ہیں۔

جبکہ علاماتِ بعیدہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ووفات، اور ظہورِ فتن وغیرہ ہیں۔

کچھ علماء نے ایک تیسری قسم کا بھی ذکر کیا ہے، یعنی: علاماتِ وسطی، مثلاً: علم کا اٹھ جانا اور جہل کا پھیل جانا، قتل وغارت گری، تقاربِ اسواق، تقارب ازمان وغیرہ وغیرہ۔

حدیث جبریل میں مذکور علامات کا بیان

حدیث جبریل میں قیامت کی دو علامتوں کا ذکر ہے:

① (أن تلد الأمة ربتها) یعنی: لونڈی اپنے آقا کو جنے۔

یہ کثرتِ فتوحات کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے، چنانچہ ایک شخص اپنی لونڈی سے ہمبستری کرے گا، اور وہ اس کیلئے بچہ جنے گی، یوں وہ لونڈی اپنے آقا کے بچے کی ماں کہلائے گی جسے اُم ولد کہا جاتا ہے، بچہ کا باپ چونکہ اس لونڈی کا آقا ہے، اس تعلق سے اس کا بیٹا بھی اس کا آقا ہی شمار ہوگا۔

[1] صحیح بخاری:۵۹

یا پھر اس جملہ سے مقصود یہ بتلانا ہے کہ احوال بڑی تیزی سے متغیر ہونگے اور اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمان بنتی جائے گی، نافرمانی اس حد تک بڑھ جائے گی اور بچے اپنے والدین پر یوں حکم چلائیں گے کہ محسوس ہوگا کہ اولاد اپنے ماں باپ کی آقا ہے۔

②(وأن ترى الحفاة العراة العالة رعاء الشاء يتطاولون في البنيان)

یعنی: اور تو دیکھے ننگے پاؤں، ننگے جسموں والے فقیروں کو، نیز بکریوں کے چرواہوں کو، بڑی بڑی عمارتوں میں فخر کرنے والے۔

(الحفاة): حافی کی جمع ہے، جس کا معنی: ننگے پاؤں۔

(العراة): عاری کی جمع ہے، جس کا معنی: ننگے بدن۔

(العالة): عائل کی جمع ہے، جس کا معنی: فقیر۔

نبی ﷺ کے اس فرمان سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جنہیں پہننے کو جوتا تک میسر نہ تھا، بدن کافی لباس سے محروم تھا، اور معیشت انتہائی فقر کے ساتھ بسر ہوتی تھی، مویشی چرا کر تھوڑا بہت گذارہ کرلیا کرتے تھے، یکلخت ان کے احوال تبدیل ہوجائیں گے، اور وہ شہروں میں بڑی بڑی بلڈنگوں کے مالک بن جائیں گے، بلکہ عمارتوں کی بلندی پر ایک دوسرے سے سبقت لیجانے اور فخر کرنے کی کوشش کریں گے۔

شیخ عبدالمحسن العباد ﷾ فرماتے ہیں: وهاتان العلامتان قد وقعتا یعنی: یہ دونوں علامتیں واقع ہوچکی ہیں۔

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمارے اس دور میں عمارتوں کے ذریعہ فخر کا سلسلہ بہت بڑھ گیاہے، اگرچہ یہ تفاخر ہر دور میں رہا ہے، اور ہر دور کے لوگ اپنے دور کے تفاخر کو علامت قیامت ہی قرار دیتے رہے ہیں۔ واللہ اعلم

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

حدیث جبریل کا آخری حصہ

(ثم انطلق فلبثت مليا ثم قال لي: يا عمر أتدري من السائل؟ قلت: الله ورسوله أعلم. قال: فإنه جبريل أتاكم يعلمكم دينكم)

یعنی: پھر وہ شخص چلاگیا، میں کچھ عرصہ (تین دن) ٹھہرا، پھر مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عمر! کیا جانتے ہو یا سائل کون تھا؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ سائل جبریل امین علیہ السلام تھے جو تمہارے پاس تمہیں، تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت صحابہ کرام کو آگاہ فرمادیا تھا کہ یہ سائل جبریل علیہ السلام ہیں، جبکہ اس حدیث میں (مليا) کالفظ ہے، جس کی تفسیر بیشتر علماء نے تین دن سے کی ہے، بظاہر ان دونوں حدیثوں میں تعارض دکھائی دے رہا ہے۔

یہاں جمع اور تطبیق کی صورت ممکن ہے، اور وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے تمام حاضرین کو اسی وقت یہ بتادیا تھا کہ یہ سائل جبریل علیہ السلام ہیں، ممکن ہے جناب عمر رضی اللہ عنہ اس وقت مجلس سے جاچکے ہوں، بعد میں وہ رسول اللہ ﷺ سے ملے ہوں اور آپ ﷺ نے انہیں یہ خبر دی ہو۔

۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞۞

خاتمہ

(حدیث جبریل سے حاصل ہونے والے کچھ فوائد)

شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث بہت سے فوائد پر مشتمل ہے، اگر کوئی شخص اس حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد خواہ منطوقاً ہوں یا مفہوماً یا اشارةً، کا استنباط کرنا چاہے تو ایک بہت بڑی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

اس وقت ہمارے سامنے جو چند فوائد متحضر ہیں، بالاختصار ان کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ (شیخ کے ذکر کردہ فوائد کی تلخیص کے ساتھ ساتھ کچھ ہمارے زوائد بھی شامل ہونگے):

(۱) ہم نے حدیث جبریل میں پڑھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، یہ آپ ﷺ کے حسن خلق اور حسن تواضع کا ثبوت ہے، آپ ﷺ کبھی اپنے آپ کو کسی منفرد مقام کا حامل نہیں سمجھتے تھے نہ ہی اپنے آپ کو ان سے فوقیت والا شمار کیا کرتے تھے۔

احادیث میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ ایک لونڈی آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور آپ ﷺ کو اپنے گھر لاتی تاکہ آپ اس کی بکری کا دودھ دوھ دیں، اسی معنی میں آپ ﷺ کے ہجرت الی المدینہ کے دوران، ام معبد الخزاعیہ کے خیمے میں جانے کا قصہ ملتا ہے، جب آپ ﷺ نے اس کے خیمے میں کھانے پینے کی کوئی چیز نہ پائی، اور اس کی کمزور سی بکری دیکھی تو اپنے مبارک ہاتھ اس کے تھنوں پر پھیرے، اللہ تعالیٰ نے اس بکری سے دودھ جاری کردیا، جو آپ نے ام معبد کو پلایا۔[1]

واضح ہو کہ یہ تواضع بندے کے مقام کو گرانے یا گھٹانے کا سبب نہیں بنتی، بلکہ اس کی رفعت میں مزید اضافے کا باعث بنتی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان مبارک بھی ہے: (من تواضع للہ رفعہ اللہ) یعنی: جو اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے بلندیاں عطا فرمائے گا۔

(۲) حدیث جبریل سے طلبۃ العلم کا اپنے شیخ کے ساتھ بیٹھنے کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ نشست اخلاص پر مبنی ہو اور زیادہ سے زیادہ علمی استفادہ کا قصد ہو، محض وقت کا ضیاع مقصود نہ ہو۔

(۳) ملائکہ کے دوسری شکلوں میں متشکل ہونے کے امکان کا بھی علم ہوا؛ کیونکہ اس

[1] مستدرک حاکم ۴۲۷۴

حدیث کے مطابق جبریل علیہ السلام اپنی شکل میں نہیں بلکہ انسانی شکل میں نمودار ہوئے تھے۔

البتہ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ فرشتوں کا کسی دوسری شکل میں متشکل ہونا ان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ ہے۔

اس واقعہ سے بعض اہلِ ھوی نے بڑا بیہودہ استدلال کیا ہے اور وہ یہ کہ آج کل کے مروجہ ڈراموں کا جواز فراہم ہو رہا ہے؛ کیونکہ ڈراموں میں فنکار دوسری شکلیں دھار کر کسی کردار کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔

یہ انتہائی بودا استدلال بلکہ شبہ ہے، جس کی حیثیت تارِ عنکبوت سے بھی کمزور ہے؛ کیونکہ جبریل علیہ السلام کا بصورتِ بشر آنا اللہ تعالیٰ کے امر سے تھا اور صدق وحق کی اساس پر تھا، جبکہ یہ ڈرامے فحش، کذب اور بیہودگی کا مرقع ہوتے ہیں، افسوس یہ ہے کہ یہ استدلال ان لوگوں کی طرف سے آیا ہے جو انبیاء کرام کی سیرتوں اور واقعات کو ڈرامائی رنگ سے پیش کرتے ہیں۔ یہ عصرِ حاضر کا بہت بڑا فتنہ ہے، جس کی آڑ میں امت کو بے راہ روی، ذلت وضلالت کی آگ میں جھونکا جارہا ہے۔ فإنا لله وإنا إليه راجعون.

(۴) جبریل علیہ السلام کا رسول اللہ ﷺ کے سامنے انتہائی مؤدب ہوکر بیٹھنا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ شاگرد اپنے شیخ کے ادب کے تقاضے لازمی طور پہ سمجھتا ہو اور انہیں پورا کرتا ہو۔

(۵) جبریل علیہ السلام کا اپنی بات شروع کرتے ہوئے (یا محمد) کہنا، توریہ کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے؛ کیونکہ (یا محمد) کہنے کا اسلوب اعرابیوں کا تھا اور جبریل علیہ السلام اپنے معاملہ کو مخفی رکھنے کیلئے ایک اعرابی ہونے کا تاثر دینا چاہتے تھے، کیونکہ متمدن افراد رسول اکرم ﷺ کو (یا محمد) کہہ کر ہرگز نہیں پکارا کرتے تھے۔

(۶) جبریل علیہ السلام نے پہلا سوال، اسلام کی بابت کیا، جس سے اسلام کی فضیلت اور اہمیت عیاں ہوتی ہے، اسلام کی تعریف کا پہلا نکتہ (لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ) کی شہادت ہے، اور یہی

دعوتِ دین کا نکتۂ آغاز ہے، اس لئے اسلام کی دعوت اور تعلیم ہر شئ پر مقدم ہے۔

(۷) رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تعریف میں پانچ امور کا ذکر فرمایا، انہی پانچ امور کو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ارکانِ اسلام قرار دیا گیا ہے، وہ پانچ امور حسب ترتیب یہ ہیں:

شہادتین، نماز، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج بیت اللہ۔

(۸) شہادتین کے بعد نماز کا ذکر ہے، جو نماز کی اہمیت وفضیلت کی دلیل ہے اور اس امر کی متقاضی ہے کہ شہادتین کے بعد نماز ہی ہر رکن اسلام پر مقدم ہے۔

(۹) نماز کا ذکر (تقیم الصلاۃ) کے الفاظ کے ساتھ وارد ہے، جس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ نماز کو قائم کرنا ضروری ہے، محض پڑھ لینا کافی نہیں، اور نماز کے قائم ہونے کیلئے سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک طریقہ کے مطابق ادا کی جائے، اور یہ مبارک طریقہ نماز کے تمام افعال پر منطبق ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: (صلوا کما رأیتمونی أصلی)

(۱۰) یہ بھی معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے۔

اسلام کے پانچوں ارکان میں سے پہلے رکن یعنی (لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کی شہادت کا تارک بالاتفاق کافر ہے، بقیہ ارکان کے تارک کے بارہ میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء نے بقیہ ارکان کے تارک کو بھی کافر قرار دیا ہے، لیکن یہ قول ضعیف ہے، کچھ علماء تارکِ صلاۃ کی تکفیر کے قائل ہیں، جبکہ بیشتر علماء تارکِ صلاۃ کو کافر تو کہتے ہیں مگر کفر سے مراد عملی کفر لیتے ہیں۔ واللہ اعلم

واضح ہو کہ اگر ایک شخص نماز کے وجوب کا منکر ہے تو وہ بالاجماع کافر ہے، خواہ وہ عملی طور پہ نماز پڑھتا ہو۔

(۱۱) حدیث جبریل سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان دو مختلف چیزیں ہیں؛ کیونکہ

جبریل علیہ السلام نے پہلے اسلام کی بابت سوال کیا پھر ایمان کے متعلق۔ جو ان دونوں کے مابین تغایر کی دلیل ہے۔

البتہ اس کے متعلق سلف صالحین کی علمی مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تغایر اس وقت ہوگا جب اسلام اور ایمان کسی سیاق میں اکٹھے مذکور ہوں، اگر کہیں صرف ایمان کا ذکر ہو تو اسلام اس میں شامل ہوگا، اسی طرح اگر کہیں صرف اسلام کا ذکر ہو تو ایمان اس میں داخل ہوگا۔

مثلاً: قولہ تعالیٰ:

[وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا] [1]

اور قولہ تعالیٰ:

[فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ] [2]

میں صرف اسلام کا ذکر ہے، لہذا یہ ایمان کو شامل ہوگا۔

اور قولہ تعالیٰ: [وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ] [3]

اور قولہ تعالیٰ: [تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ] [4]

میں صرف ایمان کا ذکر ہے، لہذا یہ اسلام کو شامل ہوگا۔

جہاں ایمان اور اسلام اکٹھے مذکور ہونگے وہاں اسلام سے مراد اعمالِ ظاہرہ ہونگے، جن کا تعلق زبان اور دیگر اعضاء سے ہو، اور ایمان سے مراد اعمالِ باطنہ ہونگے جن کا تعلق قلبی اعمال واعتقادات سے ہو۔

حدیث جبریل اسی تغایر وتفریق کی دلیل ہے۔ اسی طرح قولہ تعالیٰ: [قَالَتِ الْأَعْرَابُ

[1] المائدہ:۳
[2] آل عمران:۲۰
[3] الصف:۱۳
[4] الصف:۱۱

اٰمَنَّا ۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔] [1]
میں ایمان اور اسلام ایک سیاق کے تحت اکٹھے مذکور ہیں لہذا دونوں میں فرق ہوگا، صرف ترجمہ دیکھ لینے سے ہی یہ فرق مفہوم ہو جائے گا۔

ترجمہ: کہا اعراب نے ہم ایمان لے آئے، کہہ دو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو ہم اسلام لے آئے، اب تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا۔

(۱۲) ایمان کے چھ ارکان ہیں، جن کا بیان پچھلے صفحات میں ہو چکا، ان ارکان کا فہم انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے کما حقہ خوف کی طاقت مہیا کرے گا۔

(۱۳) چونکہ ایمان کے چھ ارکان کی خبر اللہ کے رسول ﷺ نے دی ہے، لہذا ان ارکان کا منکر کافر ہوگا، بلکہ ان میں سے کسی ایک رکن کا منکر بھی کافر ہوگا۔

(۱۴) ارکانِ ایمان میں سب سے مقدم رکن، ایمان باللہ ہے، یہ تمام معتقدات کا سردار ہے، اصل دین ہے، ایک مکلف کیلئے سب سے پہلا فریضہ اللہ تعالیٰ کی توحید کی معرفت ہے، خواہ وہ توحید ربوبیت ہو یا توحید الوہیت یا توحید اسماء وصفات ۔جس شدت اور قوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگی اسی قدر اللہ تعالیٰ کی طرف انابت واخبات میں اضافہ ہوتا جائے گا، اس کا خوف بڑھے گا، اس ذات پر توکل قائم ہوگا۔ جس شخص کے ایمان باللہ میں کوئی کوتاہی پائی گئی اس کا کوئی عمل قابل قبول نہ ہوگا [ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ] بلکہ ایمان کے دیگر ارکان کا قبول بھی قطعاً مفید نہ ہوگا۔ وباللہ التوفیق

(۱۵) فرشتوں کا اثبات معلوم ہوا، ان پر بھی ایمان لانا واجب ہے، کچھ لوگ فرشتوں کو محض عقول قرار دیتے ہیں اور کچھ بغیر جسم کے روح سمجھتے ہیں، یہ دونوں قول باطل ہیں۔

حق یہ ہے کہ فرشتوں کے باقاعدہ جسم ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[1] الحجرات:۱۴

[جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ] [1]

یعنی: (اللہ تعالیٰ) بنانے والا ہے فرشتوں کو جو کہ پَروں والے ہیں، اپنے نمائندے۔

فرشتوں کا پروں والا ہونا ان کے اجسام کی دلیل ہے۔

حدیث سے فرشتوں کے انتہائی وزنی ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:(اطت السماء وحق لها أن تئط ما من موضع أربع أصابع إلا وفيه ملك قائم لله وراكع أو ساجد)

یعنی: آسمانوں میں (فرشتوں کی کثرت تعداد کی بناء پر بہت زیادہ وزن کی وجہ سے) چرچراہٹ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، چنانچہ آسمانوں میں چار انگلیوں کے برابر جگہ خالی نہیں ملتی، مگر وہاں فرشتہ موجود ہے، قیام کرتا ہوا یا رکوع کرتا ہوا یا سجدہ کرتا ہوا۔

اس کے علاوہ احادیث سے جبریل علیہ السلام کے چھ سو پروں کا ثبوت ملتا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ فرشتے محض ارواح یا عقول کا نام نہیں بلکہ باقاعدہ اجسام ہیں۔

کچھ لوگ تو فرشتوں کو نفس انسانی میں موجود خیر کی قوت قرار دیتے ہیں اور شیاطین کو نفس انسانی میں موجود شر کی قوت قرار دیتے ہیں، یہ قول سابقہ اقوال کے مقابلے میں بڑا باطل ہے۔

(۱۶) تمام آسمانی کتب وصحف خواہ ان کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہو یا نہ ہو پر ایمان لانا بھی ارکان ایمان میں سے ہے۔

کسی ایک کتاب کی تکذیب، تمام کتب سماویہ کی تکذیب قرار دی جائے گی۔

(۱۷) تمام انبیاء ومرسلین پر ایمان لانا بھی، ارکانِ ایمان میں سے ہے، اگر کوئی شخص صرف اپنے رسول پر ایمان لے آئے اور باقی تمام رسولوں کا انکار کردے تو اس کا اپنے رسول پر ایمان لانا بھی قابل قبول نہ ہوگا، بلکہ وہ شخص کافر قرار پائے گا کہ کسی ایک رسول کی تکذیب تمام انبیاء

[1] فاطر:۱

کی تکذیب کے مترادف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قومِ نوح کے بارہ میں فرمایا: [كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٠٥﴾][1] یعنی: قومِ نوح نے تمام رسولوں کا انکار کر دیا۔

حالانکہ انہوں نے صرف اپنے رسول نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی مگر ان کی تکذیب، تمام انبیاء کی تکذیب قرار دی گئی۔

(۱۸) یومِ آخرت کا اثبات و ایمان بھی، ارکانِ ایمان میں شامل ہے، یومِ آخرت سے مراد قیامت کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ حساب وکتاب کیلئے تمام لوگوں کو اٹھائے گا، اس حساب کے نتیجے میں اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ جہنم، جہنم میں ٹھکانہ پائیں گے۔

رسول اکرم ﷺ کی مکی زندگی کا بیشتر حصہ آخرت اور قیامت کی تفصیلات بیان کرنے میں صرف ہوا؛ کیونکہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے انکار کی وجہ عقیدۂ آخرت قرار دی تھی، ان کے بقول مرنے کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا محال ہے، رسول اللہ ﷺ نے بڑے واضح دلائل وبراہین کی روشنی میں عقیدۂ آخرت پیش فرمایا، کچھ دلائل سابقہ صفحات میں گذر چکے ہیں۔

(۱۹) تقدیر پر ایمان لانا خواہ وہ خیر ہو یا شر، ارکانِ ایمان میں سے ہے، تقدیر پر مکمل ایمان اس شخص کا قرار پائے گا جو ان چاروں مراتب کو کما حقہ قبول کرلے، جن کا گذشتہ صفحات میں، تقدیر کی بحث میں بیان ہو چکا ہے، وہ مراتب یہ ہیں: ① علم ② کتابت ③ مشیئت ④ خلق، تفصیلات جاننے کیلئے گذشتہ صفحات میں مذکور تقدیر کی بحث کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۲۰) حدیث کے سیاق سے یہ علم ہوا کہ تقدیر خیر بھی ہے اور شر بھی، شر کے تعلق سے وضاحت گذر چکی، یہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ شر تقدیر میں نہیں بلکہ مقدور میں ہے، جس کی وضاحت یوں ہے کہ تقدیر چونکہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا نام ہے، لہذا وہ سب کے سب خیر ہیں، رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے: (والشر ليس إليك) یعنی: شر تیری طرف منسوب نہیں ہے، لہذا اللہ تعالیٰ کی قضاء

[1] الشعراء:۱۰۵

وقدر میں کوئی شر نہیں؛ کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت وحکمت سے صادر ہے، اور محض شر تو شریر سے صادر ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں تو خیر وشر دونوں کو تقدیر کہا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شر تقدیر میں نہیں بلکہ مقدورات ومخلوقات میں ہے؛ کیونکہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا فعل ہے وہ کیسے شر ہوسکتا ہے؟

ایک مثال سے اس کی وضاحت پیش کی جاتی ہے:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ][1]

یعنی: خشکی وتری میں فساد ظاہر ہوا، بوجہ اس کے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا۔

اس آیت کریمہ میں زمین میں رونما ہونے والے فساد اور اس کے سبب کا ذکر ہے، (یہ فساد تقدیر میں لکھا ہوا ہے) آگے آیت کریمہ میں اس کی حکمت مذکور ہے، فرمایا: [لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤١﴾] یعنی: تاکہ لوگوں کو ان کی کچھ کرتوتوں کی سزا چکھائے، شاید کہ وہ دین کی طرف لوٹ آئیں۔

اب زمین میں ظاہر ہونے والے مصائب مثلاً: خشک سالی، فقر، بیماری وغیرہ تکلیف دہ امور ہیں، یہ کیوں رونما ہوئے؟ یہ لوگوں کی بداعمالیوں کی بناء پر رونما ہوئے۔

لیکن ان کا نتیجہ انتہائی خیر ہے، یعنی: لوگ کچھ سزا پا کر دین کی طرف لوٹ آئیں، تو اللہ تعالیٰ کا یہ امر مقدر اگرچہ من وجہ لوگوں کیلئے اذیت کا باعث ہے، مگر انجام کار انتہائی بہترین ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تقدیر، اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو شر نہیں ہے، اور مقدور جو امر مقدر ہے، خیر یا شر ہوسکتا ہے، مخلوق میں شر کا موجود ہونا کئی حکمتوں کی بناء پر ہے:

[1] الروم:۴۱

ایک حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ اس شر کے ذریعے خیر کو پہچانا جائے، کہا جاتا ہے: وبضدها تتبين الأشياء یعنی: اشیاء، اپنی اضداد کے ساتھ عیاں ہوتی ہیں۔

دوسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شر کو دیکھ کر لوگ اپنے رب کی طرف لاچار ہوں۔

تیسری حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ سچی توبہ کی طرف آمادہ ہو جائیں۔

اسی لئے دنیا میں موجود شرور سے حفاظت کیلئے ہم صبح وشام اذکار کرتے رہتے ہیں، اور ایسے اوراد کا اہتمام کرتے ہیں جو ہمیں شرور سے محفوظ رکھنے کا سبب بن جائیں۔

لہذا اللہ تعالی کا ہر فعل خیر ہے، بندہ اگر اس حقیقت کو دل وجان سے پہچان کر قبول کرلے تو ہر مقدور پر اسے تسلی حاصل رہے گی، اگر کسی مقدور کا ظاہر شر ہو گا تو وہ یہ یقین رکھے گا کہ اس کا انجام خیر ہی ہو گا۔

جو انسان اس طرح تقدیر کے ساتھ راضی ہو گیا وہ ہر غم سے نجات پا گیا، رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بہت ہی قابل غور ہے: فرمایا:

(المؤمن القوی خیر وأحب إلى الله من المؤمن الضعیف وفی كل خیر إحرص على ما ینفعك واستعن بالله ولا تعجز، وإن أصابك شئ فلا تقل لو أنی فعلت كذا لكان كذا ،فإن لو تفتح عمل الشیطان)[1]

یعنی: طاقت ور مؤمن، اللہ تعالی کے نزدیک کمزور مؤمن سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے، سب میں خیر موجود ہے، تو اس چیز کی حرص کر جو تجھے نفع دے اور اللہ تعالی سے مدد طلب کر، اور عاجز اور کمزور نہ بن (اس کے بعد) اگر تجھے کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اس طرح مت کہہ: اگر میں نے یوں کرلیا ہوتا تو یوں ہو جاتا؛ کیونکہ اگر مگر کہنا، شیطان کے عمل کو کھولتا ہے۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نفع بخش چیزوں کی حرص کی تعلیم دی ہے، چنانچہ اس

[1] صحیح مسلم: ۲۶۶۴

کیلئے جدوجہد کی جائے، اس کے باوجود اگر نقصان ہو جائے تو اسے اللہ تعالی کی تقدیر اور اس کا فعل قرار دیکر اور یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ اس میں ضرور خیر کا پہلو موجود ہے۔

واضح ہو کہ قوی مؤمن سے مراد وہ شخص نہیں جو جسمانی اعتبار سے طاقت ور ہو، بلکہ اس سے مراد قوی الایمان شخص ہے۔

بہر حال شر اللہ تعالی کی طرف منسوب نہیں ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (والشر ليس إليك) بلکہ مخلوقات کی طرف منسوب ہے کما فی قولہ تعالی: [قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝]

ایک سوال باقی رہ گیا کہ مخلوقات شریرہ کی خلق وتقدیر میں کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

جواب: بہت بڑی حکمت ہے، اگر مخلوقاتِ شریرہ کا وجود نہ ہوتا تو ہم مخلوقاتِ خیر کی قدر نہ پہچان پاتے، مثال کے طور پہ بھیڑیا، چھوٹے سے جسم کا ایک جانور ہے، اونٹ کے مقابلے میں تو بہت ہی چھوٹا ہے، مگر وہ انسان کو کھا جاتا ہے، جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا: [وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ][1] یعنی: میں ڈرتا ہوں کہ اسے (یوسف علیہ السلام) بھیڑیا نہ کھا جائے۔

جبکہ اونٹ کبیر الجسم ہونے کے باوجود انسان کو نہیں کھاتا بلکہ ایک چھوٹا بچہ بھی اسے ہانک کرلے جا سکتا ہے۔

اب یہاں اللہ تعالی کی حکمت بالغہ پر غور کیجئے، جو اونٹ اور بھیڑیے دونوں کا خالق ہے، بھیڑیا جو ایک مخلوق ہے اس کے اندر موجود شر کا مادہ جب دیکھتے ہیں تو اس سے بڑی مخلوق یعنی اونٹ کے اندر موجود خیر کے مادہ کی قدر معلوم ہوتی ہے، نیز حکمت الٰہیہ بھی سمجھ میں آتی ہے، اللہ تعالی نے بھی اونٹ کے متعلق ہمیں تدبر کی دعوت دی ہے، فرمایا:

[1] یوسف: ۱۳

[اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ﴿۱۷﴾]¹

یعنی: کیا یہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔

تمام امور ہمارے پروردگار کے ہاتھ میں ہیں، کائنات میں موجود ہر شئ اسی کی قدرتِ کاملہ کا شاہکار ہے۔

(۲۱) حدیث جبریل سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قیامت کے وقوع کا علم صرف اللہ رب العزت کے پاس ہے؛ کیونکہ ملائکہ میں سب سے افضل ہستی جبریل علیہ السلام نے، انبیاء کرام میں سے سب سے افضل شخصیت محمد ﷺ سے قیامت کے وقوع کے بارہ میں پوچھا، تو انہوں نے ارشاد فرمایا: (ما المسئول عنها بأعلم من السائل) یعنی: قیامت کے وقوع کے بارہ میں مسئول، سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔

اب اگر کوئی بھی شخص اپنے مزعومہ قرائن کی روشنی میں قیامت کے قائم ہونے کے وقت کا دعویٰ کرتا ہے یا اس دنیا کی عمر کے تعین کی جسارت کرتا ہے تو وہ جھوٹا قرار دیا جائے گا، بلکہ اس کی یہ جسارت موجب کفر ہوگی؛ کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ظاہراً تکذیب کا پہلو موجود ہے، بلکہ جو شخص ایسے لوگوں کی تصدیق کر بیٹھتا ہے وہ بھی مرتکب کفر ہے۔ والعیاذ باللہ

(۲۲) قیامت کی عظمت و ہیبت کا بھی علم ہوا، وہ اس طرح کہ قیامت قائم ہونے سے قبل بڑی بڑی علامات رونما ہونگی، یہ قیامت کی ہیبت کی دلیل ہیں، نیز یہ علامات انسانوں کو لمحۂ فکریہ مہیا کرتی ہیں کہ اب بھی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرکے آخرت کی تیاری پر توجہ دو۔

(۲۳) جب کسی شئ کا علم نہ ہو تو اس کی نشانیوں کی بابت سوال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ جبریل علیہ السلام نے [أخبرني عن أمارا تها] کہہ کر قیامت کی علامات کا سوال کیا تھا۔

(۲۴) حدیث جبریل میں قیامت کی دو علامتوں کا ذکر ہے، جن کی تفصیل گذشتہ صفحات میں

¹ الغاشیة:۱۷

گذر چکی ہے فلیراجع إلیها.

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی دوسری علامات کا ذکر کیوں نہ فرمایا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری علامات بالکل واضح ہیں، جن کیلئے سوال کی حاجت نہیں ہے، رسول اکرم ﷺ کا کلام انتہائی جامع ومانع ہوتا تھا، لہذا آپ ﷺ نے مختصراً ان دو علامات کے ذکر پر اکتفاء فرمایا، دیگر احادیث میں قیامت کی بہت سی علامات مذکور ہیں، جنہیں کتب حدیث میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(۲۵) جبریل امین علیہ السلام اپنے سوالات کے مکمل جوابات لیکر روانہ ہوگئے، جس کا ذکر حدیث میں ان لفظوں کے ساتھ ہے: [ثم انطلق] یعنی: پھر جبریل چلے گئے، اس سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ فرشتے جب انسانی شکل میں متشکل ہوتے ہیں تو وہ چلتے بھی انسانوں ہی کی طرح ہیں، ورنہ فرشتوں کی اپنی خلقت پروں کے ساتھ ہے، جن کے ذریعے ان کا آنا جانا، اُڑان کے ساتھ ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیۡۤ اَجۡنِحَۃٍ مَّثۡنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ؕ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۱﴾]¹

یعنی: اس اللہ کے لئے تمام تعریفیں سزاوار ہیں جو (ابتداءً) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور دو دو تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو اپنا پیغمبر (قاصد) بنانے والا ہے، مخلوق میں جو چاہے زیادتی کرتا ہے اللہ تعالیٰ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲۶) اگر طلبۃ العلم پر کوئی علمی نکتہ مخفی رہ گیا ہو تو شیخ کا ازخود اس کی وضاحت کرنا ایک مستحسن امر ہے، وضاحت کیلئے وہ سوالیہ اسلوب بھی اختیار کرسکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل امین کے چلے جانے کے بعد حاضرین سے یہ سوال کیا تھا (أتدرون من السائل؟) کیا تم جانتے ہو یہ

سائل کون تھا؟ اور یہی سوال امیر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے تقریباً تین دن بعد فرمایا تھا: (أتدری من السائل؟) کیا تم جانتے ہو وہ سائل کون تھا؟

اس سے ثابت ہوا کہ شیخ اپنے طلبۃ العلم کو سمجھانے اور سکھانے کیلئے استفہامیہ اسلوب اختیار کرسکتا ہے۔

(۲۷) جبریل امین علیہ السلام سائل بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے تھے، اور ان کی آمد کا مقصد لوگوں کو ان کا دین سکھانا تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: (فانہ جبریل أتاکم یعلمکم دینکم) یہ جبریل تھے، جو تمہارے پاس آئے تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے کیلئے۔ (خود سیکھنے کیلئے نہیں کیونکہ انہیں یہ سب معلوم تھا)

اس سے دو بڑے اہم نکتے حاصل ہورہے ہیں: ایک یہ کہ ایک شخص، لوگوں کی موجودگی میں انہیں کوئی چیز سکھانے اور سمجھانے کیلئے شیخ یا مفتی سے سوال کرسکتا ہے، جیسا کہ جبریل علیہ السلام نے کیا۔

دوسرا یہ کہ کسی طالب علم کو خواہ ایک مسئلہ معلوم ہو، پھر بھی اس مسئلہ کی بابت اپنے شیخ سے سوال کرسکتا ہے، شیخ کے جواب سے اگر دیگر حاضرین بھی مستفید ہورہے ہیں تو وہ سائل بھی ان کیلئے معلم کے مقام پر ہوگا، جیسا کہ جبریل علیہ السلام کو باوجود سائل ہونے کے، معلم کہا گیا۔

(۲۸) حدیث جبریل میں مذکور تمام امور، دین قرار پائیں گے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: (یعلمکم دینکم)

لیکن اس حدیث میں دین کا بیان، بصورتِ اجمال ہے، بصورتِ تفصیل نہیں، تفصیل کیلئے کتاب وسنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: (الدین النصیحۃ) یعنی: دین خیرخواہی کا نام ہے (یہ بات آپ نے تین بار ارشاد فرمائی) اس کے بعد فرمایا: (للہ ولکتابہ

ولرسولہ ولأئمۃ المسلمین وعامتھم)[1] یعنی: اللہ تعالیٰ کیلئے، اور اس کی کتاب کیلئے اور اس کے رسول کیلئے اور مسلمان حکام کیلئے اور عامۃ الناس کیلئے۔

حدیث جبریل میں مذکور تمام امور، بہترین خیرخواہی ہیں، جبریل علیہ السلام کی طرف سے بھی اور رسول کریم ﷺ کی طرف سے بھی۔

(۲۹) حدیث جبریل سے حاصل ہونے والا اہم ترین فائدہ

جبریل علیہ السلام تمام انبیاء کرام کے امین وحی تھے، اور ہمارے آخری نبی اکرم الخلائق، سید البشر محمد مصطفی ﷺ کے بھی امین وحی تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝][2]

اسے امانت دار فرشتہ (جبریل علیہ السلام) لے کر آیا ہے آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہوجائیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پورا دین، دین وحی ہے، جو جبریل علیہ السلام کی وساطت سے آپ ﷺ تک پہنچا، یہ دونوں حقیقتیں سورہ نجم کے شروع میں بیان ہیں:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝][3]

یعنی: اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم: ۵۵

[2] الشعراء: ۱۹۴، ۱۹۳

[3] النجم: ۵-۳

رسول اللہ ﷺ پر نزولِ وحی کا زمانہ تیئیس سال کے عرصہ پر محیط ہے، ہر وحی جبریل علیہ السلام لیکر آئے، اور اس وحی میں ان کی حیثیت مفتی اور معلم کی ہوتی اور رسول اکرم ﷺ ایک طالب اور سامع کی حیثیت سے اس وحی کا سماع فرماتے اور پھر صحابہ کرام کے سامنے بیان فرمادیتے۔

لیکن آج جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں ایک بالکل جدا اور منفرد شکل میں تشریف لائے، معلم بن کر نہیں بلکہ سائل بن کر، اور آج رسول اللہ ﷺ ان کی موجودگی میں ایک معلم اور مفتی کے بطور ان کے سوالات کے جوابات ارشاد فرمارہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ آج جبریل علیہ السلام بطورِ معلم، تعلیم کیوں نہیں دے رہے؟ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیوں کررہے ہیں؟

اس کی بنیادی وجہ واللہ اعلم یہ ہوسکتی ہے کہ آج کی تعلیم کا سارا معاملہ صحابہ کرام کے سامنے ہورہا ہے، لہذا جبریل علیہ السلام بطورِ معلم نہیں، بطورِ سائل پیش ہوئے، اس میں یہ تنبیہ ہے کہ لوگوں کے سامنے امورِ دین میں گفتگو کا حق صرف محمد رسول اللہ ﷺ کیلئے ہے، لوگوں کی موجودگی میں جبریل علیہ السلام بھی بطورِ سائل ہی تشریف لائیں گے۔

یہ حدیث اس پہلو سے رسول اللہ ﷺ کا مرتبہ ومقام متعین کرتی ہے، جو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنی امت کے افراد کے مابین تشریف فرما ہوں تو کوئی شخص خواہ وہ جبریل امین ہی کیوں نہ ہو بطورِ مفتی یا معلم پیش نہیں ہوسکتا، لوگوں کے سامنے یہ حق صرف امام الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے۔

یہی فکرِ اہلِ حدیث ودعوتِ اہلِ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں یا آپ ﷺ کے فرمان کی موجودگی میں کسی مجتہد یا مفتی کا فتویٰ یا قول نہیں چل سکتا، اور رسول اللہ ﷺ کے مبارک عمل یا پاکیزہ فرمان کے مقابلہ میں کسی کا قول وقرار پیش کرنا مطلقاً حرام اور ناجائز ہے، اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے تمام لوگوں کو اور بالخصوص اصحابِ مذاہب کو اپنی روش اور کردار کا جائزہ لینا چاہئے، ضروری ہے کہ ہمارا منہج اور کردار رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا آئینہ دار ہو:

(كل أمتي يدخلون الجنة إلا من أبى، قالوا: يا رسول الله! ومن يأبى؟ قال: من أطاعني دخل الجنة، ومن عصاني فقد أبى)[1]

ترجمہ: میری پوری امت جنت میں داخل ہوگی علاوہ اس شخص کے جس نے جنت میں داخل ہونے سے خود انکار کردیا ہو، صحابہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ جنت میں داخل ہونے سے کون انکار کرسکتا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے میری اطاعت کی وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کردیا۔

(۳۰) حدیث جبریل پر تھوڑا سا تامل کرنے والے پر یہ نکتہ آسانی سے عیاں ہوجائے گا کہ حدیث رسول ﷺ بھی، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پیارے نبی محمد ﷺ کی احادیث مبارکہ کے تعلق سے حسنِ اہتمام کی توفیق ارزاں فرمادے، اور یہ توفیق بھی عطا فرمادے کہ ہمارے ظاہر وباطن کے جملہ اعمال پر صرف رسول اللہ ﷺ کی پیاری سنتوں کی چھاپ ہو، ہماری زندگی بھر کے اوڑھنے اور بچھونے کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہوں، تمام عبادات بلکہ عادات پر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا رنگ ہو، اور پھر اس اتباع کا صلہ بھی عطا فرمادے، جو اس آیت کریمہ میں موجود ہے:

[قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱] [2]

یہ صلہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور گناہوں کی بخشش سے عبارت ہے۔

والتوفيق بيد الله تعالى وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وأصحابه وأهل طاعته أجمعين.

---

[1] صحیح بخاری: ۷۲۸۰، من حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

[2] آل عمران: ۳۱